

Issue Jan - Mar 2026



اولیا کونسل آف نار تھ امریکہ کی پیش کش رہ سہ ماہی صوفی ٹائمز

QUARTERLY
SUFİ TIMES



ناشر
اولیا کونسل آف نار تھ امریکا

زیر سرپرستی: داعی اسلام شیخ ابو سعید محمدی صفوی

جلد نمبر ۳۰



مدیر اعلیٰ: مولانا علی سعید صفوی

مجلس مشاورت

مولانا سید کامران چشتی، ڈاکٹر ذیشان مصباحی
ڈاکٹر مجیب الرحمن علیی، مولانا ضیاء الرحمن علیی
مولانا غلام مصطفیٰ ازہری، مولانا محمد ذکی
ڈاکٹر حفیظ الرحمن

مجلس ادارت

چیف ایڈیٹر: (انگلش) ڈاکٹر مہدی کاظمی
چیف ایڈیٹر: (اردو) مفتی امام الدین سعیدی
مدیر مسئول: ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی
ترجمین کار: محمد آفتاب عالم قادری

ای میل aulyacouncil@gmail.com

صفحات 65

نوٹ - مضمون نگار کے افکار و نظریات سے ادارے کا اتفاق ہونا ضروری نہیں

Publisher - Auliya Council of North America

85 Mt Hope Rd, Mahopac, NY 10541, United States

فہرست

شمار نمبر	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
-----------	--------	------------	------

نورِ عرفان، ادارہ و حکمت و معرفت

۱	حاملینِ قرآن بنیں	داعی اسلام شیخ ابوسعید محمدی صفوی	۶
۲	امام حسین: عدل و عمل کی پکار	ڈاکٹر مہدی کاظمی	۸
۳	مشائخِ چشت کی انسانیت نوازی	مفتی امام الدین سعیدی	۱۲
۴	فلسفہ روزہ اور اس کی معنویت	ڈاکٹر ایل قادری	۱۶
۵	خواجہ غریب نواز: طریقہ دعوت و تبلیغ	مولانا اختر تابس ازہری	۲۰

تحقیقی سیکشن

۶	مثالی معاشرے کا قرآنی منشور	مفتی آفتاب رشک مصباحی	۲۶
---	-----------------------------	-----------------------	----

نقش خیال

۷	سماع: روح کی بیداری کا منظم سفر	رضا احمد رومی	۳۷
۸	غزل	فیصل صدیقی	۴۰
۹	غزل	داغ دہلوی	۴۲

سرگرمیاں

۴۸	ادارہ	اولیاء کونسل آف نار تھ امریکا کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا جامع جائزہ	۱۰
----	-------	--	----

English Section

11	The Third of Shaban: Imam Husain and His Call for Justice and Action	53
	Dr. M. Mehdi Kazmi	
12	Ecology in Islamic Thought	58
	Ali Saeed Safawi	
13	Sama: A Disciplined Journey of the Heart and the Awakening of the Soul	63
	Raza Ahmad Rumi	

نور عرفان

QUARTERLY
SUFITIMES

QUARTERLY SUFI TIMES

JAN FEB MAR 2026

عرفانی مجلس۔ افادات شیخ ابو سعید صفوی



حاملینِ قرآن بنیں

رمضان المبارک کا مہینہ قرآن کریم سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ اس مہینے میں قرآن کی تلاوت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اسی لیے اس مبارک مہینے میں کثرت سے تلاوتِ قرآن کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ وہی مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل فرمایا۔ لہذا عام لوگوں کو بھی چاہیے کہ رمضان میں تلاوتِ قرآن کا خاص اہتمام کریں، کم از کم ایک مرتبہ قرآن کریم مکمل پڑھیں، اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کی تلاوت کو غور سے سنیں، اس کے معانی میں تدبر کریں اور اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہی سب مل کر قرآن کا حقیقی احترام ہے۔

قرآن پر ایمان کے کئی تقاضے اور درجے ہیں، مثلاً: قرآن کی تلاوت کرنا، قرآن کو سمجھنا، قرآن کو سننا، قرآن پر عمل کرنا اور قرآن کو آگے پہنچانا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے۔ قرآن نور ہے، قرآن شفا ہے، قرآن ہدایت ہے اور قرآن رحمت ہے۔ قرآن کی تلاوت کرنا آسان ہے، اس کی تفسیر بیان کرنا بھی کسی حد تک آسان ہے، اور عام انداز میں اس کی بات دوسروں تک پہنچانا بھی سہل ہے، لیکن قرآن پر عمل کرنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔ اس لیے کہ قرآن پر عمل کرنے کے لیے خواہشاتِ نفس کو قربان کرنا اور نفس کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔

قرآن کا اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والا خود قرآن بن جائے، تاکہ اس کی زندگی میں قرآن کی تعلیمات جھلکنے لگیں۔ قرآن صرف پڑھنے، حفظ کرنے یا خوش الحانی سے سنانے کے لیے نازل نہیں ہوا، بلکہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور زندگی میں نافذ کیا جائے۔ لہذا قرآن کی روشنی میں اپنے عقائد، اعمال، اخلاق، کردار، معاملات اور پورے طرزِ زندگی کی اصلاح کی جائے۔ یہی قرآن کے مطابق زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔

(ترتیب: مفتی امام الدین سعیدی)



اداریہ

QUARTERLY
SUFITIMES

QUARTERLY SUFI TIMES

JAN FEB MAR 2026

امام حسین: عدل و عمل کی پکار

ڈاکٹر ایم مہدی کاظمی



اسلامی فہم کے مطابق خدا اور انسان کے درمیان تعلق کی بنیاد ایک ازلی عہد پر قائم ہے جسے المیثاق کہا جاتا ہے یہ وہ عہد ہے جو حضرت آدمؑ کی تمام اولاد سے لیا گیا۔ اس عہد کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان فطری طور پر ربوبیت الہی کی پہچان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، ایک ایسا شعور جو انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ قرآن مجید اس عہد کو نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے: اور یاد کرو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے خود ان کے بارے میں گواہی لی (اور فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں (الاعراف ۷۲:۷۳)۔ اس فطری پہچان کو فطرت کہا جاتا ہے۔ وہ فطری میلان جس کے ذریعے کوئی انسان خدا سے کامل لاعلمی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ شعور نہ تہذیب کا پیدا کردہ ہے، نہ تعلیم یا تاریخ کا نتیجہ؛ بلکہ ان سب سے ماقبل ہے اور انسانی شعور کی اخلاقی و روحانی بنیاد کو تشکیل دیتا ہے۔

اس عہد کی نوعیت نہ سیاسی ہے اور نہ قبائلی، بلکہ بنیادی طور پر روحانی اور اخلاقی ہے۔ یہ استحقاق کے بجائے ذمہ داری پر قائم ہے۔ خدا کی جانب سے اس عہد کا تقاضا انبیاء اور وحی کے ذریعے ہدایت، توبہ کے ذریعے رحمت، اور عدل پر مبنی جزا کا وعدہ ہے۔ اس کے بالمقابل انسان پر چند بنیادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں: توحید، یعنی وحدانیت الہی کا اقرار؛ الہی ہدایت کی اطاعت؛ عدل، صداقت اور رحمت پر مبنی اخلاقی طرز عمل؛ اور اپنے ہر فعل کے لیے مکمل جواب دہی۔ اس تناظر میں عدل محض ایک سماجی انتظام یا قانونی تصور نہیں، بلکہ ایمان کے عملی اظہار کا نام ہے وعدوں کی پاسداری، انصاف اور اخلاقی توازن کا تحفظ۔

یہ عہد تاریخ کے مختلف ادوار میں آنے والے انبیاء کے ذریعے بار بار تازہ کیا گیا۔ ہر نبی نے وحی، اخلاقی قانون اور سماجی اصلاح کے ذریعے انسانیت کو اس کی یاد دہانی کرائی۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے ساتھ یہ عہد اپنی آخری اور آفاقی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

قرآن آخری محفوظ ہدایت بن کر سامنے آیا اور اسلام کا اخلاقی نظام اس عہد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جینے کا طریقہ فراہم کرتا ہے۔ تاہم یہ ایمان محض ایک خاموش، غیر فعال یا فکری وابستگی کے لیے نہیں تھا؛ یہ ایسا ایمان تھا جو واضح اخلاقی حدود متعین کرے، ظلم کا سامنا کرے اور معاشروں کی تشکیل نو کی صلاحیت رکھتا ہو حتیٰ کہ جان کی قربانی کی قیمت پر بھی۔

اس تصور کا مرکزی ستون ذاتی ذمہ داری ہے۔ ہر فرد اپنے اعمال کے لیے خدا کے حضور خود جواب دہ ہے؛ نہ کوئی موروٹی گناہ ہے اور نہ کوئی موروٹی نیکی۔ نہ کوئی اقتدار گناہ کو معاف کر سکتا ہے اور نہ کوئی نسب اخلاقی عمل کا نعم البدل بن سکتا ہے۔ یوں یہ عہد محض عقیدے سے نہیں بلکہ ضمیر اور کردار کے ذریعے جیا جاتا ہے۔

اسی اخلاقی اور الہیاتی فریم ورک میں امام حسین ابن علیؑ ایک فیصلہ کن اخلاقی کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کا قیام فردی عہد کی مجسم صورت ہے یعنی اس بات سے انکار کہ ظلم کو مذہبی جواز عطا کیا جائے۔ امام حسین محض سیاسی حالات پر ردِ عمل دینے والی ایک تاریخی شخصیت نہیں تھے، بلکہ ایک انقلابی ضمیر تھے، جو یہ واضح کرتے ہیں کہ جب طاقت عدل سے منہ موڑ لے تو عہد کی وفاداری مزاحمت کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کے قیام کے ذریعے عہد کی نئی تعریف نہیں کی گئی بلکہ اسے مٹنے سے بچایا گیا۔

قرآنی تصورِ عہد اسلام میں اپنی سماجی صورت اختیار کرتا ہے۔ محض ایک مذہبی روایت کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی اصول کے طور پر۔ رسول اللہ ﷺ ایسے عالم میں مبعوث ہوئے جو شدید انتشار کا شکار تھا۔ قبائلی عرب خونریز دأروں میں پھنسا ہوا تھا، جبکہ ہمسایہ عظیم سلطنتیں بازنطینی اور ساسانی تھکن، زوال اور اخلاقی کھوکھلا پن کا شکار تھیں۔ مشرقِ قریب کی دنیا بکھرے ہوئے مراکز اور ٹوٹی ہوئی تہذیبوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ جہاں کہیں امن تھا بھی، وہ حل نہیں بلکہ تھکن کی علامت تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس صورتِ حال کو انسانیت کی جانب سے عہدِ الہی کی پامالی کا نتیجہ سمجھا اور اس کا جواب نہ دنیا سے کنارہ کشی تھا اور نہ محض فتوحات، بلکہ ایک ایسا اخلاقی نظام پیش کرنا تھا جو قرآن و سنت پر مبنی ہو اور عہد کو عملی عدل، امن اور سماجی استحکام میں ڈھال دے۔

اس زاویے سے انسانی تاریخ کو دیکھا جائے تو وہ عہد کی وفاداری اور ترکِ عہد کی مسلسل کشمکش کی داستان بن جاتی ہے۔ ترقی محض مادی یا تکنیکی نہیں بلکہ اخلاقی اور تعلقاتی بھی ہے۔ حقیقی پیش رفت اسی وقت ممکن ہے جب انسانی ادارے اور نظام عدل، مساوات اور تمام مخلوقات کی بھلائی سے ہم آہنگ ہوں۔

جیسے ہی تیسرا شعبان امام حسین کی ولادت کا دن قریب آتا ہے، ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس انقلابی عہد شعور کو از سرِ نو بیدار کریں۔

امام حسین کا پورا سفر مدینہ سے مکہ، مکہ سے کربلا، اور کربلا کی اخلاقی زندگی تک نہ محض سیاسی بغاوت ہے اور نہ روایتی معنوں میں ایک الم ناک قربانی، بلکہ خدا اور انسان کے درمیان عہد کے تحفظ کے لیے ایک شعوری اور اصولی اقدام ہے۔ کربلا دراصل ایک معرکہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور الہیاتی محاسبہ تھی۔

کوئی بھی سیاسی اقتدار جو اس عہد کی قیمت پر اطاعت کا مطالبہ کرے، اپنی تعریف میں ہی ناجائز ہو جاتا ہے خواہ وہ کتنے ہی دعوے کیوں نہ رکھتا ہو۔ یہی وہ حد تھی جسے یزید بن معاویہ نے عبور کیا۔ امام حسین سے بیعت کا مطالبہ محض سیاسی وفاداری نہیں تھا بلکہ ایک ایسے نظام کو مذہبی جواز دینے کی کوشش تھی جو ظلم، جبر، موروثی استبداد اور اخلاقی انحطاط پر قائم تھا۔ اگر امام حسین بیعت کر لیتے تو ظلم اسلامی معمول بن جاتا اور عہد الہی عملاً منسوخ ہو جاتا۔

امام حسین نے اس حقیقت کو پوری وضاحت سے سمجھا۔ انکار جذباتی یا وقتی نہیں بلکہ قانونی، اخلاقی اور الہیاتی تھا۔ انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے قیام نہیں کیا، بلکہ اسے خدا کی طرف سے عائد کردہ ناگزیر ذمہ داری سمجھا۔ اس معنی میں کربلا کا انتخاب نہیں کیا گیا بلکہ عہد کی وفاداری نے اسے لازم کر دیا۔

یہی شعور ان کے منسوب الفاظ میں جھلکتا ہے: اے خدا! میں نے تیرا حق ادا کر دیا، اب تو اپنا وعدہ پورا فرما۔ یہ نہ مایوسی تھی اور نہ ذاتی نجات کی فریاد، بلکہ اس اعلان کی صورت تھی کہ انسان کی جانب سے عہد اعلیٰ ترین قیمت پر پورا کیا جا چکا ہے۔ کربلا کو محض ایک ”جنگ“ کہنا اس کی حقیقت کو مسخ کرنا ہے۔ نہ یہ افواج کا معرکہ تھا اور نہ زمین یا اقتدار کی کشمکش۔ یہ ظلم کے پردے کو چاک کرنے، جھوٹے اختیار کو جائز ماننے سے انکار، اور ابدی اخلاقی امتیاز قائم کرنے کا عمل تھا۔ امام حسین جیتنے کے لیے نہیں کھڑے ہوئے، بلکہ اس لیے کہ حق خاموشی سے نہ مرجائے۔

اگر یہ قیام نہ ہوتا تو اسلام میں مزاحمت کا تصور ہی ختم ہو جاتا، اور ظلم کو اطاعتِ خدا سمجھ لیا جاتا۔ انسانیت اخلاقی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو جاتی۔

کربلا کے بعد دنیا دو راستوں کے درمیان جھولتی ہے: ایک حسینی راستہ عدل، وقار، مساوات، اخلاقی جرأت اور آزادیِ ضمیر کا راستہ؛ اور دوسرا یزیدی راستہ جس میں ظلم کو نظم، غلبے کو استحکام، اور مذہب کو ضمیر دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کی منتشر مسلم دنیا اس حقیقت کی گواہ ہے کہ حسینی اخلاق سے انحراف کس انجام تک لے جاتا ہے۔ یوں حسینی تصور محض ایک تاریخی یا دینی فرقہ وارانہ علامت نہیں، بلکہ انسانی ترقی کا آخری اخلاقی آلہ ہے۔ یہ اعلان کرتا ہے کہ عدل کے بغیر ایمان کھوکھلا ہے، اخلاق کے بغیر طاقت ناجائز ہے، اور ظلم پر خاموشی عہد شکنی ہے۔ کربلا سوگ کا نہیں، عمل کا اصول ہے۔

کر بلا اس اٹل حقیقت کی توثیق کرتی ہے کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور انسانی اقتدار اسی حد تک جائز ہے جس حد تک وہ عدل، وقار اور جواب دہی کی خدمت کرے۔ امام حسین کا قیام اقتدار کی طلب نہیں بلکہ ظلم کو مقدس بنانے سے انکار تھا۔ اسی روشنی میں کربلا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اور ہر اس مقام پر صدائیں جاتی ہے جہاں انسانی ارادہ دبایا جائے اور اخلاقی سچائی خاموش کر دی جائے۔ ظلم کے خلاف مزاحمت بغاوت نہیں بلکہ حاکمیت الہی سے وفاداری ہے۔ لہذا ہمیں لازم ہے کہ خدا کی حاکمیت سے اپنی وابستگی کو محض نعرہ نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے طور پر تازہ کریں، اور اس بات کو تسلیم کریں کہ انسانی ارادہ آزادی کے ساتھ ذمہ داری بھی رکھتا ہے۔ عدل، مساوات اور امن کے لیے ثابت قدم رہنا، اور ہر صورت ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ہی عہد کی تکمیل ہے وہ عہد جس پر ایمان کی سچائی اور انسانی ترقی دونوں قائم ہیں۔



- **Dr. M. Mehdi Kazmi**
- Auliya Council of North America
- Phone: +1 (914) 525-1945
- E-Mail: montesynapse@gmail.com



مشائخِ چشت کی انسانیت نوازی

مفتی امام الدین سعیدی



اسلامی تاریخ میں تصوف کے سارے سلاسل و مشارب نے انسانیت کی خدمت، اخلاقِ حسنہ اور روحانی تربیت کے بے شمار روشن نقوش چھوڑے ہیں، مگر سلسلہ چشتیہ اپنی بے مثال انسانیت نوازی، وسعتِ قلب، محبت اور رواداری کے سبب ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برصغیر میں اسلام کے پیغام کو جس حکمت، حلم اور اخلاق کے ساتھ چشتی مشائخ نے دلوں میں اتارا، وہ تلوار یا جبر سے نہیں بلکہ کردار، خدمت اور محبت کے ذریعے تھا۔ آج بھی ان کا پیغام ہر دور کے انسان کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں مشائخِ چشت کی انسانیت نوازی کے اہم پہلو تفصیل کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں:

انسانی احترام و تکریم:

بلا تفریق مذہب و مسلک، رنگ و نسل، سلسلہ چشت کے مشائخ نے انسان کو محض اس کے انسان ہونے کی بنیاد پر قابلِ احترام قرار دیا۔ خواجہ خواجگاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کا یہ معروف قول کہ ”محبت سب سے کرو، نفرت کسی سے نہ کرو“، درحقیقت ان کے پورے نظامِ فکر و تربیت کا خلاصہ ہے۔ وہ اپنی خانقاہ کے دروازے پر آنے والے ہر فرد بشر، خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب، سب سے یکساں محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، لہذا کسی بھی نسلی، مذہبی یا معاشرتی بنیاد پر اس کی تحقیر جائز نہیں۔ چشتی خانقاہیں آج بھی اس وسعتِ قلبی اور آفاقی انسان دوستی کی علامت ہیں۔ یہی قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** (اسراء: ۷۰)۔ اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سہل بن حنیف اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما قادیسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ آپ دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تو یہودیوں کے ایک غیر مسلم کا جنازہ ہے۔ تو انہوں نے کہا: **إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِهِ جَنَازَةً فَقَامَ، فَقِيلَ لَهُ: إِنَّهَا جَنَازَةٌ يَهُودِيٍّ، فَقَالَ: أَلَيْسَتْ نَفْسًا؟** (متفق علیہ)۔ یعنی نبی ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا گیا: یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ فرمایا: کیا وہ ایک جان نہیں ہے؟

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ سے عرض کیا گیا: یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ انسانی جان نہیں ہے؟ ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام میں تمام انسانی جان محترم ہے اور اس کی تکریم کا درس دیا گیا ہے۔ اب رہی بات کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ایک مسلمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے، وہ انسانی نوعیت کا ہونا چاہیے، نہ کہ مذہبی تعصب کے ساتھ۔

غریبوں اور مظلوموں کی خدمت:

مشائخِ چشت کی انسانیت نوازی کا سب سے نمایاں اور عملی پہلو خدمتِ خلق ہے۔ انہوں نے اپنی زندگیاں فقراء، مساکین، یتیموں، بے سہارا افراد اور مظلوم انسانوں کی اعانت کے لیے وقف کر دیں۔ سماج میں جو مظلوم و بے بس افراد ہوتے، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، ان کو سینے سے لگا کر اپنی محبت و شفقت سے سرشار کر دینا اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا مشائخِ چشت کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر عمل پیرا تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ (طبرانی: ۵۷۸۷)۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ فرماتے ہیں: کل بازار قیامت میں اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ قدر و قیمت والا عمل کوئی دوسرا نہیں ہوگا کہ کسی شکستہ دل کو راحت پہنچائی جائے۔ (فوائد الفوائد)

لنگر کی روایت:

بھوکوں کو کھانا کھلانا، بغیر کسی تفریق کے، چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، سب کے لیے ایک دسترخوان لگتا ہے اور اس پر بیٹھ کر ایک ساتھ سب کو ایک ہی قسم کا کھانا بطورِ لنگر ملتا ہے۔ یہ چشتی خانقاہوں و درگاہوں کی قدیم اور تاریخی روایت رہی ہے، جو آج بھی لاکھوں افراد کے لیے ذریعہ برکت ہے۔ یہ تصور چشتی خانقاہوں سے ہی فروغ پایا۔ وہ اپنے مریدوں کو تلقین کرتے تھے کہ: ”خدمت میں لذت ہے، اور بندگی کا راز بھی خدمت ہی میں پوشیدہ ہے۔“ خواجہ غریب نواز خود اپنے دستِ مبارک سے غریبوں کو کھانا کھلاتے، کپڑے فراہم کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ چشتی خانقاہوں میں لنگر صرف جسمانی بھوک نہیں مٹاتا تھا بلکہ دلوں کے فاصلے بھی کم کرتا تھا۔

بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری:

چشتی مشائخ نے مذہبی اختلافات کو نفرت کا ذریعہ بنانے کے بجائے محبت اور مکالمے کا پل بنایا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں ہندو، سکھ، جین، بدھ اور دیگر مذاہب کے افراد بلا جھجک آتے اور روحانی سکون حاصل کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دلوں کو جوڑنا سنتِ نبویؐ تھی، جبکہ مذہبی بنیادوں پر نفرت پھیلانا انسانیت کے منافی تھا۔

اسی رواداری نے برصغیر کی تہذیب کو گہرے طور پر متاثر کیا اور مختلف مذاہب کے درمیان امن، برداشت اور باہمی احترام کو فروغ دیا۔

عدم تشدد اور امن کا پیغام:

چشتی مشائخ کا پیغام طاقت، جبر یا تشدد پر مبنی نہیں تھا بلکہ اخلاق، نرم دلی اور محبت سے دلوں میں اتارنا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے نظریات زبردستی مسلط نہیں کیے بلکہ اپنے عملی کردار سے لوگوں کے دل جیتے۔ ان کا بنیادی اصول تھا: ”جو دل کے راستے بدلتا ہے، وہی تبدیلی دائمی ہوتی ہے۔“ اسی وجہ سے ان کی تعلیمات نے صلح، امن اور عدم تشدد کو فروغ دیا، اور ان کے حلقہ اثر میں ہر مذہب اور ہر طبقے کے افراد شامل رہے۔

سماجی عدل اور مساوات:

مشائخ چشت کے نزدیک انسان کی فضیلت کا معیار تقویٰ اور اخلاق تھا، نہ کہ نسل، ذات، خاندان یا سماجی حیثیت۔ انہوں نے ذات پات، چھوت چھات اور اعلیٰ و ادنیٰ جیسے تصورات کو سختی سے رد کیا۔ ان کی خانقاہ میں بادشاہ بھی آئے تو عام انسانوں کے ساتھ بیٹھے۔ ذات پات کے خلاف ان کی تعلیمات نے برصغیر کے سماجی ڈھانچے کو نئی سمت عطا کی۔ چشتی خانقاہی نظام سماجی مساوات کا ایک عملی نمونہ تھا، جہاں ہر فرد برابر تھا۔

الغرض، مشائخ چشت کی انسانیت نوازی آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آج کے دور میں، جب معاشرتی تقسیم، مذہبی منافرت اور نفسیاتی بے چینی عام ہو چکی ہے، مشائخ چشت کی تعلیمات ہمیں یہ یاد دلاتی ہیں کہ: انسانیت کی خدمت ہی اصل دین ہے۔



SUFI TIMES

■ **Mufti Imamuddin Saeedi**

- Director of Education: ACNA
- WhatsApp: +977 982-2058193
- E-Mail: abuhzaifa83@gmail.com

حکمت و معرفت

QUARTERLY
SUFITIMES

فلسفہ روزہ اور اس کی معنویت

ڈاکٹر ایس قادری



یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ انسان کا علم محدود ہے، اس کی قوتِ فکر محدود ہے، اور اس کی عقل بھی محدود ہے، جب کہ خالق کائنات کے احکام و قوانین میں جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں وہ لامحدود ہیں۔ ان سب کا علم رکھنا ہم انسانوں کے بس میں نہیں۔ ایسے ہی روزے کے اندر بھی بے شمار حکمتیں اور فوائد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہماری کوتاہ عقل کی پہنچ وہاں تک نہیں ہو سکتی، اور ہم اس کے مکلف بھی نہیں۔ ہم بندے ہیں، ہمارا کام طاعت و بندگی ہے، کہ یہی ہمارے لیے شرف و کمال اور سرمایہ حیات ہے۔ ہم اس دنیا میں بطور آزمائش آئے ہیں، اور آزمائش کا مطلب مصائب و آلام نہیں بلکہ امتحان ہے۔ گویا دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء، اور ہمیں یہ زندگی اسی لیے دی گئی ہے کہ ہم مختلف امتحانات سے گزریں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمُ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُوْرُ (المکمل)

اللہ تعالیٰ نے موت اور زندگی بنائی تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرتا ہے۔ وہ غالب اور بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ جب تک ہم دنیا میں ہیں، ہماری بندگی کا امتحان ہے کہ ہمارے اندر اللہ رب العزت کی اطاعت کا جذبہ کتنا ہے۔ روزہ بھی اسی امتحان کا ایک حصہ ہے، جس میں ہمیں کھانے پینے اور شہوات و خواہشات سے روک دیا جاتا ہے، جو کہ اصل میں مباح اور جائز ہیں۔ روزہ ایک ایسا عمل ہے جو سراپا اخلاص والا عمل ہے۔ اس میں ریا کا کچھ دخل نہیں۔ اگر کوئی ریا کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا، جب کہ دوسرے اعمال میں ریا کا دخل ہو سکتا ہے۔ روزے کی حالت میں اگر آپ نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا، جہاں کوئی بھی آپ کو دیکھ نہیں سکتا کہ آپ کھا رہے ہیں یا نہیں، وہاں آپ کھا سکتے ہیں، مگر کھاتے نہیں، یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے روزہ حقیقت میں سراپا اخلاص والی عبادت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جھوٹ، غیبت، چغلی، حرام مال وغیرہ دوسرے گناہوں سے، جن کا نفع و نقصان لوگوں کو بخوبی معلوم ہے، روکتا ہے تو یہ ایسا حکم ہے جسے عقل تسلیم کرتی ہے۔

لیکن جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندے کی بندگی اور اپنی رضا کے لیے اس کی تسلیم و رضا کا امتحان لیتا ہے تو کھانے پینے سے روک دیتا ہے، صرف اس لیے کہ اس میں بہت ساری حکمتیں اور فوائد ہیں، جیسے بندوں کی ظاہری اور باطنی اصلاح و تربیت وغیرہ۔

۱ روزے کے ظاہری ثمرات

۱۔ روزے کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو جانچتا ہے۔ اب جس کے نزدیک کھانے پینے سے زیادہ اللہ کی رضا اہم ہے وہ روزہ رکھتا ہے، اور جس کے نزدیک اللہ کی رضا سے زیادہ کھانا پینا اہم ہے وہ روزے سے محروم رہتا ہے۔ گویا روزہ فرماں بردار اور نافرمان بندوں کو ظاہر کرتا ہے، طالبِ مولیٰ اور طالبِ نفس کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے۔

۲۔ یہ ہمارے اندر ایک اچھی عادت پیدا کرنے کی تربیت ہے کہ جس طرح ہم روزے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جائز اور مباح چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں، ایسے ہی ماہِ رمضان کے بعد سال بھر ہماری یہ عادت باقی رہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف اور حرام چیزیں ہیں ان سے بچتے رہیں۔ یعنی اس میں تعمیلِ حکم اور اطاعتِ شکاری کا مکمل درس ہے۔

۳۔ روزہ انسان کو صبر کا عادی بناتا ہے، تاکہ بندہ ناگوار حالات اور دشواریوں میں بھی صبر کا مظاہرہ کر سکے۔ بھوک کی حالت بھی ایک دشوار حالت ہے کہ کھانا بالکل سامنے ہے اور بھوک کی شدت بھی ہے، مگر نہیں کھا سکتے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ سختیاں برداشت کرو اور مشقت جھیلنے کی عادت ڈالو۔

۴۔ روزہ بندے کو فقر و عاجزی کی تعلیم بھی دیتا ہے، اور اس کے مزاج سے انانیت و تکبر اور فخر و مباہات کو ختم کرتا ہے۔ اس کے پاس عمدہ کھانا ہوتا ہے، مگر وہ اتنا مجبور ہے کہ کھا نہیں سکتا، اتنا کمزور ہے کہ اس کی اپنی مرضی کچھ نہیں۔ وہ کھانا رکھ کر بھی کھانے کے لیے کسی کا محتاج ہے۔ چنانچہ روزے کی حالت میں انسان سراپا فقر کا نمونہ ہو جاتا ہے، اور یہی فقر اس کے لیے شرف و کمال کی بات ہے۔

۵۔ روزے میں جب بھوک کی شدت محسوس ہوتی ہے تو ان لوگوں کو جو آسودہ حال رہتے ہیں اور ہمیشہ اچھا کھاتے پیتے ہیں، اُن محتاج اور مسکین لوگوں کا درد اور اُن کی پریشانی کا احساس ہوتا ہے جو نہ جانے کتنی راتیں غربت و افلاس کی چھت کے نیچے بغیر کھائے پیے گزار دیتے ہیں۔

بھوک کی تکلیف کیا ہوتی ہے، بندہ روزے میں ان کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ تبھی اس کے دل میں دوسرے انسان کے لیے ہمدردی اور غمِ خواری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور یہی اسلام کا اصل اخلاقی سرمایہ ہے۔

۶۔ بندہ جب تک روزے کی حالت میں رہتا ہے تو وہ فرشتوں کے مشابہ ہوتا ہے، چوں کہ فرشتے کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے پاک ہوتے ہیں، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں۔

چنانچہ روزے میں بھی انسان اسی صفت کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح فرشتوں کا کوئی بھی لمحہ طاعت و بندگی سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح روزہ دار کا بھی کوئی لمحہ طاعت و بندگی سے خالی نہیں ہوتا۔ گویا انسان روزے کی حالت میں ملکوتی زندگی گزارتا ہے۔

۲ روزے کے باطنی اثرات

امام محمد غزالی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ روزے کے تین درجے ہیں:

۱۔ عوام کا روزہ

۲۔ خواص کا روزہ

۳۔ انحصار خواص کا روزہ

عوام کا روزہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور ازدواجی تعلق سے باز رہے۔ یہ سب سے کم درجہ ہے۔ انحصار خواص کا روزہ یہ ہے کہ بندہ اپنے دل کو غیر اللہ کے خیال سے پاک رکھے اور مکمل طور سے خود کو اللہ کے سپرد کر دے۔ دنیوی فکر اگرچہ مباح ہے، مگر یہ بھی روزہ کو باطل کر دیتی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے جو انبیاء و مرسلین اور صدیقین و مقربین کو حاصل ہوتا ہے۔

خواص کا روزہ یہ ہے کہ انسان صرف کھانا پینا اور ازدواجی عمل نہ چھوڑے، بلکہ اپنے تمام جسمانی اعضا کو ناشائستہ اور ناپسندیدہ حرکتوں سے بچائے۔ اس کے لیے چھ چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، مثلاً:

پہلی: یہ کہ آنکھ کو حرام چیزوں کے دیکھنے سے بچائے، اور ہر اس چیز سے بھی جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی چیزوں کی طرف نہ دیکھے جن سے نفسانی خواہشات ابھرتی ہوں۔

دوسری: یہ کہ زبان سے بیہودہ کلام نہ نکالے، اور ہر طرح کے بے فائدہ کلام سے اپنی زبان کو پاک رکھے۔

بعض علما نے غیبت اور جھوٹ کو بھی مفسدِ روزہ بتایا ہے، چاہے وہ عوام کا روزہ ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں آیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو عورتیں روزے کی حالت میں پیاس کی شدت سے ہلاکت کے قریب پہنچ گئیں اور روزہ توڑنے کی اجازت طلب کرنے لگیں۔ آپ نے ان کے پاس ایک پیالہ بھیجوایا اور فرمایا کہ وہ اس میں قے کریں۔ چنانچہ ہر ایک کے منہ سے خون کے ٹکڑے نکلے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دونوں عورتوں نے حلال چیز سے روزہ رکھا اور حرام چیز سے توڑ ڈالا، کیونکہ یہ دونوں لوگوں کی غیبت کر رہی تھیں۔

تیسری: یہ کہ کان کی حفاظت کرے، یعنی کان سے کوئی ایسی بات نہ سنے جو بُری ہو۔ اور حق بھی یہی ہے کہ جو کہنا نہیں چاہیے، اُسے سننا بھی نہیں چاہیے۔

چوتھی: یہ کہ ہاتھ پاؤں کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔ جو روزہ دار ان اعضا سے برائی کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی بیمار ہونے سے تو بچے مگر زہر کھالے۔

پانچویں: یہ کہ افطار کے وقت بہر حال حرام اور مشتبہ چیزوں کے کھانے پینے سے بچے۔
چھٹی: یہ کہ افطار کے بعد اس فکر میں رہے کہ روزہ مقبول ہوا یا نہیں۔ (تلخیص از کیمیائے سعادت، فارسی، ص ۱۸۴)

۳ بھوک کے ثمرات

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک دن رات کا کھانا جمع نہیں کیا، اور جب سے میں مسلمان ہوا، اس وقت سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا، اس لیے کہ شکم سیری کو کفر کی کنیت دی جاتی ہے۔ منقول ہے کہ اہل حقیقت نے فرمایا: شکم سیری نفس میں ایک نہر ہے جہاں شیطان پہنچتا ہے، اور بھوک روح میں ایک نہر ہے جہاں فرشتوں کا گزر ہوتا ہے۔ بشر بن حارث فرماتے ہیں کہ بھوک دل میں پاکیزگی پیدا کرتی ہے، خواہشات کو مارتی ہے اور علم کی راہیں کھولتی ہے۔
حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تصوف قیل وقال سے نہیں، بلکہ بھوک اور نفس کی مرغوب چیزوں کو چھوڑ کر حاصل کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عالم ملکوت کے دروازے سے لپٹے رہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے لیے کھل جائے۔
لوگوں نے عرض کیا: وہ کیسے؟ فرمایا کہ ہمیشہ بھوک اور پیاس کو لازم پکڑو، یہاں تک کہ عالم ملکوت کا دروازہ کھلے اور تم اس میں داخل ہو جاؤ۔ ایک بڑا ہی پیارا شعر ہے:

اگر لذت ترکِ لذت بدانی
دگر لذتِ نفس لذتِ نخوانی

یعنی اگر کوئی خواہشات کی لذتوں کو چھوڑنے کی لذت جان لے تو پھر اس کے لیے نفس کی لذت، لذت نہیں رہ جاتی۔
(سبع سنابل اردو، ص ۲۴۰-۲۴۳)

ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب عام دنوں میں کم کھانے پینے اور بھوکے رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خاص فضل فرماتا ہے اور ملکوت کے دروازے کھول دیتا ہے، تو جو بندہ روزے کو اللہ تعالیٰ کا حکم مان کر محض رضائے الہی کے لیے رمضان کا روزہ رکھے گا، اس پر رحمت کی برسات کیسے نہ ہوگی، اور اس کے لیے جنت کے دروازے کیسے نہ کھلیں گے؟

■ Dr. S. Quadri

- Jorpatti, Kathmandu Nepal
- Phone +977 9818443270



خواجہ غریب نواز قدس سرہ

طریقہ دعوت و تبلیغ

مولانا اختر تانش ازہری



دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ وہ فریضہ ہے جسے سب سے پہلے انبیائے کرام نے انجام دیا اور ان کے بعد ان کے صحابہ و تابعین عظام اور صالحین نے بحسن و خوبی نبھایا۔ جب ہم ہندوستان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سرزمین ہند میں دین کی نشرو اشاعت میں مشائخ چشت کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں سرفہرست اور مرکزی حیثیت خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ والرضوان کا رہا ہے۔ آپ کی آمد سے ہند میں اسلام کی آبیاری ہوئی اور یہ ملک اسلام کی روشنی میں جگمگانے لگا۔ اس تحریر میں ہم نے خواجہ صاحب کے دعوتی طریقہ کار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ نے ہند میں دین کی دعوت و تبلیغ کس انداز سے کی۔

محبت کی زبان سے دعوت:

دعوت دین کے میدان میں داعی کے لیے سب سے پہلا اصول محبت کی زبان ہے جو دعوت و تبلیغ کے لیے انتہائی اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب جب ہند کی سرزمین پر آئے تو اس وقت یہ کفرستان بنا ہوا تھا۔ لوگوں کے اندر نفرت کا ماحول قائم تھا۔ ایسے حالات میں دعوت کا کام کرنا گویا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ صاحب سیرالاولیا لکھتے ہیں: حضرت خواجہ صاحب کے تشریف لانے سے پہلے مملکت ہندوستان میں جہاں تک آفتاب نکلتا ہے اس کے تمام شہر کفر و کافری، بت اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ہندوستان کے سرکشوں میں سے ہر ایک انا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا بڑا رب ہوں) کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے آپ کو خدائے جل و علا کے شریک ٹھہراتا تھا۔ یہ سب پتھروں ڈھیلوں، درخت۔ چوپایوں، گائے، بیلوں اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کے اندھیروں سے ان کے دل کے قفل اور مستحکم ہو گئے تھے۔ اس آفتاب یقین کے پہنچنے کی وجہ سے جو حقیقت میں معین الدین تھے۔ اس ملک کی ظلمت نور اسلام سے روشن اور منور ہوئی

(سیرالاولیا، ص: ۱۳۰، ناشر: خواجہ حسن نظامی)

خواجہ صاحب کی نگاہوں میں سیرت طیبہ کا ایک ایک گوشہ محفوظ تھا آپ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کو نظر میں رکھتے ہوئے دین کی دعوت دی۔

جس طریقے سے آپ نے مکہ کی زمین پر لوگوں کو محبت اور دوستانہ طرز پر توحید کی طرف بلایا ایسے ہی آپ کا در تمام مخلوق خدا کے لیے کھلا تھا۔ سب سے ملتے کسی سے اس کی ذات نسل اور مذہب دریافت نہیں کرتے بلکہ ہر کوئی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا۔ محبت کی زبان اور لطیف گفتگو نے لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا اور آپ کی شخصیت محبت کی زبان سے گویا ہوئی جس سے ایمان کی روشنی پھوٹنے لگی اور خلق خدا کی ایک جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گئیں اور آپ کی ذات سے نور ایمان حاصل کیں۔ انسانیت اور اخوت کی دعوت عملی طور پر جس راجہ کے دور میں خواجہ معین الدین اجمیر تشریف لائے وہ دور چھوت چھات اور ذات پات کی عصبیت سے بھرا ہوا تھا ایسے ماحول میں دین کی دعوت کو عام کرنا یہ کئی دور کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ جس طرح کئی دور میں نفرت کا بازار گرم تھا۔ انسانیت سے لوگ کوسوں دور ہو چکے تھے نبی نے انسانیت اور بھائی چارگی سکھا ئی اور انسان کو جینے کا سلیقہ بتایا۔ خواجہ صاحب نے بھی اجمیر میں رہ کر لوگوں کو انسانیت دوستی، بھائی چارگی کی تعلیم دی اور لوگوں کو رب سے قریب کیا۔

ہندوستان کے اس دور کے سماجی حالات کے حوالے سے تاریخ مشائخ چشت کے اندر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں: گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سماجی حالت حد درجہ تباہ تھی۔ ہر شخص نہ صرف اسیر امتیاز ماؤ تھا بلکہ ایک دوسرے سے برسر پیکار اتحاد فکر و عمل کا کہیں دور دور نام نہ تھا۔ چھوت چھات نے مدنی زندگی کے سارے سرچشمے مسموم کر دیے تھے۔ زندگی کی ساری لذتیں اونچی ذات کے لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ غریب عوام جن مصائب میں مبتلا تھے۔ اُن کی دردناک تصویر ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند میں پیش کی ہے۔ زندگی اُن کے لئے بوجھ تھی۔ اللہ نے انہیں آدمی بنایا تھا، لیکن اس کے بندوں نے انہیں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

البیرونی لکھتا ہے۔ ہندوؤں میں بکثرت ذاتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کا مسلک عام مساوات نیز اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کے مطابق ان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے چھوت چھات کے اس بھیانک ماحول میں اسلام کا ”نظریہ توحید“ عملی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف ایک تختیلی چیز نہیں ہے، بلکہ زندگی کا ایک ایسا اصول ہے جس کو تسلیم کر لینے کے بعد ذات پات کی سب تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔

یہ ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کا اعلان تھا۔ ہندوستان کے بسنے والے ہزاروں وہ مظلوم انسان جن کی زبوں حالی پکار رہی تھی

چینی سے مراد ہے نہ مرنا شاید

اس اعلان کو سن کر دوبارہ زندگی کا کیف محسوس کرنے لگے۔ (تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد، ص: ۱۴۴-۱۴۵، مطبع ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۵ء) ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر فتن دور میں سسکتی ہوئی انسانیت کو اخوت اور انسان دوستی، محبت والفت کے باغ میں لانا اور ان کے اندر ان چیزوں کو پیدا کرنا کتنا کٹھن امر تھا لیکن خواجہ صاحب کی زندگی اس آیت کریمہ کے مصداق تھی ”لم تقولون مالا تفعلون“ خواجہ صاحب نے عملی طور سے تبلیغ کی جس کے اثرات خوب مرتب ہوئے اور آج بھی ہر مذہب کے لوگ آپ کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ یہ سب آپ کی لوگوں سے بے لوث محبت کی دلیل ہے۔

طریق روحانیت

دین کا مقصد جہاں علم سے لوگوں کو آراستہ کرنا ہے وہیں اس کا ایک اہم مقصد علم کے ساتھ تزکیہ و تصفیہ قلب بھی ہے اس لیے کہ جب تک انسان کا باطن نہیں سنوڑتا ہے تب تک اسے روحانی طور پر ترقی نہیں مل سکتی کیوں کہ علم انسان کے ظاہر کو سنوڑتا ہے اور تزکیہ انسان کے باطن کو درست کرتا ہے اگر انسان کا دل خراب ہو جائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ روایت میں وارد ہے خواجہ صاحب علیہ الرحمہ نے دین کے اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے لوگوں کو علم کے ساتھ ساتھ عمل اور روحانیت کی جانب توجہ مبذول کرائی تاکہ لوگ اپنے باطن کو درست کر سکے۔

آپ نے اپنی مجلس سماع اور وعظ کے ذریعے لوگوں کی روحانی تربیت فرمائی۔ سماع کے ذریعے لوگوں کے قلوب کو زندہ کیا اور ان کے اندر رب سے محبت کی جوت جگائی۔ آپ کے وعظ و نصائح پر مشتمل ملفوظات کو آپ کے خلفانے جمع کیا ہے جو تمام لوگ خاص طور پر چشتیوں کے لیے خضر راہ ہے۔ ان ملفوظات کو پڑھنا دل میں جوش پیدا کرتا ہے اور انسان کو راہ خدا کی جانب مائل کرتا ہے۔

کاروان دین پیدا کر کے دعوت

آپ نے دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے کاروان دین کو پیدا کیا اور ان کی نبوی نہج پر تربیت فرمائی جس سے ان کے اندر ایمانی حرارت پیدا ہوئی اور آپ کے ان عظیم نائبین نے دین کی ترویج و اشاعت میں وافر حصہ ادا کیا۔ جیسے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ، حضرت شیخ صوفی حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ۔ یہ دونوں بزرگ خاص طور سے قابل ذکر

ہیں جنہوں نے خواجہ صاحب کے فیض علم کو آفاق میں پھیلا یا۔ اس حوالے سے رسالہ خواجہ فخر الدین احمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ میں مرقوم ہے:

خواجہ اجیمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعد ایسے تربیت یافتہ خلفا اور جانشین چھوڑے جنہوں نے نہ صرف خواجہ اجیمیری کے مشن کی تکمیل کی کوشش کی بلکہ اپنے دائرہ کار میں مقامی حالات اور قریب رہنے والے افراد کے مزاج کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے وہ راہ اختیار کی جو متاثر کن ہونے کے ساتھ قابل قبول بھی تھی (رسالہ خواجہ فخر الدین احمد چشتی، از سید فضل المتین چشتی، ص: ۳۲۲) حضرت خواجہ صاحب نے اپنے مرید و خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی کی سرزمین پر دعوت تبلیغ کے لیے بھیجا وہاں انہوں نے اپنے شیخ کی روش پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو ایمان و عمل کی دعوت دیتے رہے۔ تاریخ مشائخ چشت میں ہیں: ”محمد غوری اور قطب الدین ایک کی فتوحات کے بعد اجیمیری کی سیاسی حیثیت اور اہمیت میں کمی آگئی۔

سلطنت کا مرکز پہلے لاہور اور پھر دہلی کو منتقل ہو گیا۔ خواجہ صاحب اس سیاسی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر اجیمیری ہی میں مقیم رہے اور جو شمع باد مخالفت کے تیز و تند جھونکوں کے درمیان روشن کی تھی اس کو جلاتے رہے۔ انہوں نے صرف ایک عزیز مرید اور خلیفہ کو دہلی میں رہ کر سلسلہ کی نشر و اشاعت پر متعین کر دیا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ نے شمالی ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کو پھیلانے کی کوشش کی اور مدت العمر اپنے پیر و مرشد کے اصولوں پر سختی سے عامل رہے۔“ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۲، طبع ندوۃ المصنفین، دہلی) اسی طرح آپ کے خلیفہ حضرت شیخ حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ نے ناگور میں قیام کیا اور وہاں دین کی نشر و اشاعت میں لگے رہے اور ایک جہاں کو اپنے علمی فیضان سے سیراب کیا۔ شیخ حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ نے اپنی علمی تصانیف اور دروس سے لوگوں کو مستفید فرمایا۔ تاریخ مشائخ چشت میں ہے: شیخ ناگوری علیہ الرحمہ صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ ان کی تصانیف، مکتوبات اور اشعار سب وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ایک کتاب اصول الطریقہ علما و صوفیہ میں بہت مقبول تھی۔ خاکسار کے قلمی کتب خانہ میں ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے جس کا ہر خط ”اے جان من“ سے شروع ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اور ہندی تینوں زبانوں پر پورا عبور تھا۔ عموماً ہندی میں گفتگو کرتے تھے۔ سرور الصدور میں ہے: بہ زبان ہندوی گفتند ہندی زبان میں گفتگو فرماتے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۵۰، طبع ندوۃ المصنفین، دہلی)

حاصل کلام یہ کہ حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کا طریقہ دعوت و تبلیغ، خدمت انسانیت اور رحمت الہی کے حسین امتزاج پر قائم تھا۔ اسی طرح آپ کا اسلوب دعوت نہ صرف تیرہویں صدی کے ہندوستان کے لیے مشعل راہ تھا بلکہ آج کی دنیا کے لیے بھی امن، محبت اور رواداری کا پیغام رکھتا ہے۔ موجودہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی اسی

خدمت انسانیت، اخوت محبت کے طرز کو اپنایا جائے اور دنیا والوں کو محبت و نرمی سے دین کی بات پیش کی جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم حضرت خواجہ کے سخیں نرم اور عملی خدمت کے اس عظیم ورثے کو محفوظ رکھیں اور اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔



■ **Maulana Akhtar Tabish Azhri**

- Jamia Arifia, India
- Phone: +91 97668 03744
- E-Mail: akhtar.tabish.azhari@gmail.com



تحقیقی سیکشن

QUARTERLY
SUFITIMES

مثالی معاشرے کا قرآنی منشور

آفتاب رشک مصباحی



تمہید۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں فکری بگاڑ، اخلاقی زوال اور عدل و انصاف کی کمی پیدا ہوئی، تو اس کے نتیجے میں انسانی جان، مال اور عزت و آبرو غیر محفوظ ہو گئیں۔ ظلم، انتشار اور بد اعتمادی نے اجتماعی زندگی کو اس حد تک متاثر کیا کہ انسان خود انسان کے لیے خطرہ بن گیا۔ دنیا کے مختلف ادوار اور تہذیبوں میں اس بحران کا حل مختلف قوانین اور ضابطوں کی صورت میں تلاش کیا گیا، مگر محض قوانین کی کثرت بھی اس وقت تک کسی معاشرے کو امن اور استحکام فراہم نہیں کر سکتی جب تک ان کی بنیاد مضبوط اخلاقی اصولوں اور درست فکری سمت پر قائم نہ ہو۔ اسلام نے انسان کو محض چند عبادات یا قانونی احکام نہیں دیے، بلکہ اسے ایک مکمل ضابطہ حیات عطا کیا جو فرد کی اصلاح سے لے کر پورے معاشرے کی تعمیر تک رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن کریم اس ضابطہ حیات کا بنیادی سرچشمہ ہے جس میں عقیدہ، اخلاق، معاشرت، معیشت اور عدل و انصاف کے ایسے اصول بیان کیے گئے ہیں جو ہر زمانے اور ہر معاشرتی حالات کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا خطاب کسی خاص دور یا قوم تک محدود نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَدَّيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطُنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ وَالْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْنَا نَزَّلْنَا ذِكْرَهُمْ فَلْتَلُبُوا الْوَعْدَ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (سورہ النعام، آیت: ۱۵۱-۱۵۳)

(اے محبوب!) آپ کہ دیں کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں بتاتا ہوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، کیوں کہ ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیں گے۔ کھلی اور چھپی کسی قسم کی بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ۔ استحقاق قتل کے علاوہ اس جان کو نہ مارو جسے اللہ نے مارنا حرام قرار دیا ہے۔ اسی کی وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ سوائے کسی بہتر طریقہ کے یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ صاحب تمیز ہو جائے۔ ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ جب بات کہو انصاف سے کہو، اگرچہ رشتہ داروں کے خلاف ہو۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو، (اللہ نے) تمہیں اسی کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ لہذا، اسی کی اتباع کرو، اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے، (اللہ نے) تمہیں اسی کا حکم دیا ہے تاکہ تم پر ہیزگار ہو جاؤ۔ مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک مثالی معاشرے کا بنیادی منشور پیش فرما دیا ہے۔ ان آیات میں توحید کو فکری بنیاد کے طور پر قائم کیا گیا۔ خاندانی نظام کو مضبوط کرنے کی ہدایات دی گئیں۔ انسانی جان کے تقدس کو واضح کیا گیا۔ اخلاقی بے راہ روی سے روکا گیا۔ کمزور طبقات کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا گیا۔ معاشی انصاف اور عدل مطلق کو لازم قرار دیا گیا۔ اور آخر میں ایک ہی صراطِ مستقیم کی پیروی کی دعوت دے کر فکری انتشار سے بچنے کا راستہ دکھایا گیا۔ یہ آیات اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ مثالی معاشرہ محض نعروں یا جذبات پر نہیں، بلکہ واضح اصولوں، متعین حدود اور ذمہ دارانہ آزادی پر قائم ہوتا ہے۔ یہاں فرد کو بھی جواب دہ بنایا گیا ہے اور اجتماعی نظام کو بھی انصاف کا پابند ٹھہرایا گیا ہے۔ نہ کسی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دی گئی ہے اور نہ ہی طاقت، قرابت یا دشمنی کو عدل پر فوقیت حاصل ہے۔ اب یہاں قرآنی آیات کی روشنی میں ایک مثالی معاشرے کے منشور کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ بات سامنے آسکے کہ اگر انسان واقعی امن، عدل، باہمی اعتماد اور انسانی وقار کا خواہاں ہے تو اس کے لیے سب سے مضبوط، متوازن اور قابلِ عمل راستہ کیا ہونا چاہیے۔

(۱) توحید — فکری وحدت اور انسانی آزادی کی بنیاد

أَلَا تُشِيرُ كُوَيْدَ شَيْئًا۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد جس اصول پر قائم ہوتی ہے وہ توحید ہے۔ توحید محض ایک عقیدہ یا چند اعتقادی جملوں کا نام نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر فکری اساس ہے جو انسان کی سوچ، اس کے رویے اور اس کے اجتماعی نظام کو متعین کرتی ہے۔ قرآن کریم نے سب سے پہلے اسی اصول کو واضح کیا کہ انسان کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، کیوں کہ فکری اور عملی شرک ہی وہ بنیادی خرابی ہے جس سے معاشرتی انتشار اور انسانی غلامی جنم لیتی ہے۔

شرک کا مفہوم محض بتوں کے سامنے جھکنے تک محدود نہیں۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے مقابلے میں طاقت کو اصل مقتدر سمجھے، دولت کو معیارِ حق بنالے، یا نسل، قوم، جماعت اور شخصیت کو اس درجہ تقدس عطا کر دے کہ حق و باطل کا فیصلہ انہی بنیادوں پر ہونے لگے، تو یہ سب عملی شرک کی صورتیں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انسان نے انسان کو حاکم مطلق مانا، یا کسی نظریے، گروہ یا شخصیت کو خطا سے بالاتر سمجھ لیا، وہاں ظلم نے قانون کی جگہ لے لی اور عدل مصلحت کا تابع بن گیا۔ توحید انسان کو ان تمام ظاہری اور باطنی غلامی سے نجات دیتی ہے۔ جب انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہ نہ کسی طاقت کے سامنے اندھی اطاعت پر آمادہ ہوتا ہے اور نہ کسی انسان کو اس درجے پر فائز کرتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر، عزت یا جان کا فیصلہ خود کرنے لگے۔ توحید انسان کے اندر یہ شعور بیدار کرتی ہے کہ ہر اختیار امانت ہے اور ہر صاحب اختیار جواب دہ ہے۔ اسی فکری بنیاد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مثالی معاشرے میں کوئی فرد، کوئی طبقہ اور کوئی ادارہ خدائی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قانون، عدل اور اخلاق سب اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے تابع ہوتے ہیں۔ نہ طاقت کو حق کا معیار بنایا جاتا ہے اور نہ اکثریت کو حق و باطل کا فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ یوں توحید ایک ایسا متوازن اور باوقار معاشرہ تشکیل دیتی ہے جہاں انسان انسان کا غلام نہیں، بلکہ سب ایک ہی رب کے بندے ہوتے ہیں، اور یہی فکری وحدت ایک مثالی معاشرے کی پہلی اور مضبوط ترین بنیاد ہے۔

(۲) والدین کے حقوق — خاندانی نظام کی بنیاد

وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ قرآن کریم نے توحید کے فوراً بعد جس حکم کو نمایاں طور پر بیان فرمایا ہے وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ یہ ترتیب بذاتِ خود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مثالی معاشرے میں خاندانی نظام کو کس قدر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ خاندان درحقیقت معاشرے کی پہلی اینٹ ہے، اور اگر یہی اینٹ کمزور ہو جائے تو پورا سماجی ڈھانچہ عدم توازن اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ والدین صرف ایک رشتہ نہیں، بلکہ نسلوں کے درمیان رابطے اور اقدار کی منتقلی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان کی عزت، خدمت اور اطاعت دراصل اس تسلسل کی حفاظت ہے جس پر ایک مہذب معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ جب والدین کی ناقدری عام ہو جائے، بزرگوں کو بوجھ سمجھا جانے لگے اور خاندانی ذمہ داریوں کو محض ذاتی سہولت پر قربان کر دیا جائے، تو اس کا نتیجہ صرف انفرادی سطح پر نہیں، بلکہ پورے معاشرے میں بے راہ روی، خود غرضی اور بد اعتمادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام نے والدین کے حقوق کو محض جذباتی وابستگی یا وقتی ہمدردی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک باقاعدہ ذمہ داری اور اخلاقی فریضہ قرار دیا ہے۔

یہاں حسن سلوک کا مطلب صرف اچھے الفاظ یا رسمی احترام نہیں، بلکہ عملی خدمت، صبر، قربانی اور ان کے حقوق کی ادائیگی، خواہ حالات موافق ہوں یا ناگوار۔ یہی ذمہ داری کا شعور انسان کو ضبط، تحمل اور ایثار سکھاتا ہے

جو اجتماعی زندگی کے لیے ناگزیر صفات ہیں۔ یوں ایک مثالی معاشرے میں والدین کے حقوق کی پاسداری محض ایک خاندانی قدر نہیں، بلکہ سماجی استحکام کی ضمانت ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں والدین باعزت ہوں، خاندان مضبوط ہوں اور نسلوں کے درمیان احترام اور ذمہ داری کا رشتہ قائم ہو، وہی معاشرہ حقیقی معنوں میں امن، توازن اور اخلاقی پختگی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے والدین کے ساتھ احسان کو مثالی معاشرے کے منشور کا ایک بنیادی ستون قرار دیا ہے۔

(۳) معاشی عدل اور اولاد کا تحفظ — انسانی وقار کی ضمانت

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ غَرِبت کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔

قرآن کریم نے توحید اور خاندانی نظام کے استحکام کے بعد جس نہایت اہم معاشرتی اصول کی طرف توجہ دلائی ہے وہ معاشی عدل اور انسانی جان کے تحفظ کا اصول ہے۔ یہ آیت دراصل اس ذہنیت کو رد کرتی ہے جس میں انسان معاشی حالات کو حتمی مقتدر سمجھ کر اخلاقی اقدار کی قربانی دینے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ رزق کی کمی یا معاشی دباؤ کسی بھی صورت میں اولاد کی جان لینے یا اس کے حق زندگی سے دستبردار ہونے کا جواز نہیں بن سکتا۔

زمانہ جاہلیت میں اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت یہ تھی کہ غربت یا معاشی عدم تحفظ کے خوف سے زندہ بچپوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ آج اگرچہ صورت بدل گئی ہے، لیکن ذہنیت کم و بیش وہی ہے۔ جدید دنیا میں یہی سوچ اسقاطِ حمل، ناپسندیدہ اولاد سے دستبرداری، یا معاشی سہولت کو انسانی جان پر ترجیح دینے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب معاشی منصوبہ بندی انسان کو اس مقام تک لے آئے کہ اولاد کو بوجھ سمجھا جانے لگے، تو یہ محض ایک طبی یا سماجی مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ ایک گہرا اخلاقی اور فکری انحراف بن جاتا ہے۔

اسلام اس طرزِ فکر کی جڑ پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ رزق کا اختیار انسان، ریاست یا معاشی نظام کے پاس نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب انسان یہ یقین کھو بیٹھتا ہے تو خوف اس کے فیصلوں پر حاوی ہو جاتا ہے، اور یہی خوف اسے ظالمانہ اور غیر انسانی اقدامات پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآن کا پیغام یہ ہے کہ معاشی تنگی کا علاج کمزوروں کی قربانی نہیں، بلکہ عدل، ذمہ داری اور توکل ہے۔ اس اصول کا معاشرتی نتیجہ یہ ہے کہ ایک مثالی معاشرہ انسانی جان کو سب سے مقدم قدر سمجھتا ہے۔ وہاں معاشی نظام اس لیے قائم نہیں کیا جاتا کہ طاقت ور محفوظ رہیں اور کمزور قربان ہو جائیں، بلکہ اس لیے کہ ہر فرد، بالخصوص بچے تحفظ، عزت اور حق زندگی کے ساتھ پروان چڑھ سکیں۔ یوں معاشی عدل اور اولاد کے تحفظ کا یہ قرآنی حکم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جہاں خوف نہیں، بلکہ اعتماد، اور خود غرضی نہیں، بلکہ ذمہ داری اجتماعی فیصلوں کی بنیاد بنتی ہے۔

(۴) اخلاقی طہارت — فرد اور معاشرے کی باطنی حفاظت

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ کھلی اور چھپی کسی قسم کی بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ۔

قرآن کریم نے انسانی معاشرے کی تعمیر میں جس اخلاقی اصول کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا ہے وہ اخلاقی طہارت کا اصول ہے۔ یہاں محض کسی ایک گناہ یا مخصوص عمل سے روکنا مقصود نہیں، بلکہ ایک پوری فکری اور نفسیاتی سمت متعین کی جا رہی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ بے حیائی کا ارتکاب نہ کرو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس اسلوب میں انسانی کمزوریوں اور اخلاقی لغزشوں کے تدریجی عمل کی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔

اسلام اخلاق کو صرف ظاہری اعمال تک محدود نہیں کرتا۔ جو گناہ ظاہر میں نظر آتے ہیں وہ اکثر ان باطنی بیماریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو دل و دماغ میں پرورش پاتی ہیں۔ نیت کی خرابی، خواہشات کی بے لگامی، فکری آلودگی اور اقدار کا بگاڑ وہ عوامل ہیں جو بالآخر عملی بے حیائی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے ظاہر اور باطن دونوں کی تطہیر کو لازم قرار دیا، تاکہ برائی کو جڑ سے ختم کیا جاسکے، نہ کہ صرف اس کی ظاہری علامات کو۔

آج کے دور میں اس حکم کی وسعت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ بے حیائی اب صرف فرد کے ذاتی فعل تک محدود نہیں رہی، بلکہ میڈیا، ادب، تفریح، فکر اور نظریات کے ذریعے اجتماعی ذہن سازی کا ذریعہ بن چکی ہے۔ جب کسی معاشرے میں برائی کو معمول، فحاشی کو آزادی اور اخلاقی حدود کو قدامت پسندی قرار دے دیا جائے، تو وہاں اخلاقی زوال محض افراد تک محدود نہیں رہتا، بلکہ پورا سماجی شعور مسخ ہو جاتا ہے۔ قرآن کا یہ حکم اسی فکری یلغار کے مقابلے میں ایک مضبوط اخلاقی حصار قائم کرتا ہے۔ اخلاقی طہارت کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ صرف قانون کے زور پر نہیں، بلکہ ضمیر کی بیداری کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ وہاں نگاہ، خیال، زبان اور عمل سب ایک اخلاقی میزان کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسا معاشرہ نہ صرف ظاہری جرائم سے محفوظ رہتا ہے، بلکہ اندرونی انتشار، نفسیاتی بے چینی اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ سے بھی بچ جاتا ہے۔ یوں اخلاقی طہارت مثالی معاشرت کی وہ بنیادی قدر ہے جو فرد کے باطن سے لے کر اجتماعی نظام تک ہر سطح پر پاکیزگی، توازن اور وقار کو یقینی بناتی ہے۔

(۵) انسانی جان کا تقدس — معاشرتی تحفظ کی بنیادی شرط

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ استحقاق قتل کے علاوہ اس جان کو نہ مارو جسے اللہ نے مارنا حرام قرار دیا ہے۔

یہ آیت انسانی زندگی کے تقدس کو اس قدر بلند مقام پر رکھتی ہے کہ اسے مثالی معاشرت کی بنیاد اور ستون قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ جان، عزت اور مال اللہ کی مقرر کردہ حدود میں محفوظ ہیں، اور ان کی خلاف ورزی نہ صرف اخلاقی جرم ہے، بلکہ معاشرتی نظام کی بنیادی تباہی کا باعث بھی بنتی ہے۔

اس حکم کی وسعت اور شدت اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام نے انسانی جان کو صرف فردی حق نہیں، بلکہ اجتماعی تحفظ کی اعلیٰ ترین قدر سمجھا ہے۔ انسانی جان کا تحفظ مثالی معاشرے کا وہ ستون ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ امن، استحکام اور انصاف کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ جب جان کی حرمت کمزور ہو جاتی ہے تو تشدد، انتقام اور قانون شکنی معاشرے میں معمول بن جاتے ہیں۔ قتل، تشدد یا موارے قانون اقدام دراصل اس بات کی علامت ہیں کہ معاشرہ اپنے اصولی مرکز سے دور ہو چکا ہے۔ ایسے معاشرے میں طاقت کے سامنے کمزور کی کوئی جگہ نہیں رہتی، اور انسان ایک دوسرے کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

اسلام نے اس لیے قتل کو سختی سے منع فرمایا کیوں کہ یہ نہ صرف فرد کی زندگی ختم کرتا ہے، بلکہ خاندان، نسل، اور اجتماعی اعتماد کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ اگر ہر شخص خود کو قانون اور انصاف کا حاکم سمجھنے لگے، تو معاشرہ خانہ جنگی اور انتشار کی طرف بڑھتا ہے۔ اس لیے قرآن نے واضح طور پر یہ اصول دیا کہ سزا اور انصاف کا فیصلہ صرف قانون اور عدلیہ کے ذریعے ہونا چاہیے، نہ کہ ذاتی انتقام، خود ساختہ عدالت یا غیر قانونی طاقت کے ذریعے۔ یہی وہ فرق ہے جو ایک مثالی معاشرے کو قانون اور نظام سے جوڑتا ہے اور انسانوں کو ایک منظم اور مہذب زندگی فراہم کرتا ہے۔ انسانی جان کا تقدس دراصل ایک اخلاقی اور قانونی پیغام ہے کہ ہر فرد اللہ کے بندے کے طور پر قابل احترام ہے۔ اس تقدس کی حفاظت سے ہی معاشرہ امن، بھروسہ اور باوقار انسانی زندگی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے جان کے تحفظ کو نہ صرف ایک فردی فریضہ، بلکہ اجتماعی نظام کا بنیادی اصول قرار دیا ہے تاکہ ہر انسان یہ یقین رکھ سکے کہ اس کی زندگی محفوظ ہے اور اس کے حقوق کے تحفظ کا ذمہ دار ایک منصفانہ اور قانون پر مبنی نظام ہے۔

(۶) یتیموں اور کمزوروں کا تحفظ — معاشرتی انصاف کی عکاسی

وَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ۔ سوائے کسی بہتر طریقہ کے یتیم کے مال کے پاس

نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ صاحب تمیز ہو جائے۔

مثالی معاشرے کی عظمت کا ایک بنیادی پیمانہ یہ ہے کہ وہ کمزوروں، یتیموں اور محروم طبقات کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ قرآن کریم نے یتیم کے مال کے بارے میں سخت احتیاط کی ہدایت دے کر یہ واضح کیا کہ کمزور طبقہ کسی بھی معاشرے کا حقیقی امتحان ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنے سب سے کمزور رکن کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو جائے، تو پھر اس کی عظمت، اخلاقی پختگی اور عدل کی بنیادیں سب کمزور ہو جاتی ہیں۔

مذکورہ آیت صرف مال کی حفاظت تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک جامع سماجی اصول چھپا ہے: یتیم اور کمزور کو اپنے حقوق دلانا، ان کی عزت برقرار رکھنا اور انہیں معاشرتی نظام میں برابر مقام دینا۔ یتیم کے مال میں دخل اندازی یا اسے اپنی مرضی سے استعمال کرنا دراصل اس کی زندگی کے تحفظ اور وقار کے خلاف ورزی ہے۔ اسلام نے یتیم کے ساتھ سلوک کو صرف

انسانی ہمدردی نہیں، بلکہ امانت داری اور جواب دہی کا معاملہ قرار دیا ہے۔ یہ اصول اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ طاقت اور اختیار کا استعمال دوسروں کی کمزوری پر ظلم کرنے کے لیے نہیں، بلکہ انصاف کے لیے ہونا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات میں احتیاط کا بہت اہم کردار ہے۔ یتیم کے مال کو چھونے یا استعمال کرنے سے پہلے اسے درست طور پر محفوظ کرنے، شفافیت برقرار رکھنے اور اس کے حق کو مکمل طور پر ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ احتیاط صرف ایک اخلاقی کیفیت نہیں، بلکہ ایک معاشرتی ضابطہ ہے جو طاقت کے غلط استعمال کو روکتا ہے۔ جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہر اختیار کے ساتھ اللہ کے سامنے جواب دہی ہے، تو وہ نہ صرف یتیم کے مال کے بارے میں محتاط رہتا ہے، بلکہ عمومی طور پر ہر کمزور کے حقوق کی پاسداری میں بھی سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یتیموں اور کمزوروں کے تحفظ کا اصول اسلامی معاشرے کے لیے محض ایک فلاحی تصور نہیں، بلکہ عدل و انصاف کی بنیاد ہے۔ ایک معاشرہ جہاں کمزوروں کی عزت اور حقوق محفوظ ہوں، وہاں طاقت ور بھی اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ قانون اور اخلاق سب کے لیے برابر ہیں۔ یوں یتیموں کی حفاظت ایک ایسی اجتماعی روح پیدا کرتی ہے جو معاشرے کو ظلم، استحصال اور بے حسی سے بچاتی ہے اور اسے حقیقی معنوں میں انسانی اور مہذب بناتی ہے۔

(۷) معاشی انصاف — اعتماد اور معاشرتی سالمیت کی بنیاد

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ۔ ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو۔

مثالی معاشرے کی تعمیر میں جس ستون کو قرآن کریم نے بارہا مضبوطی سے پیش کیا ہے وہ معاشی انصاف ہے۔ معاشی زندگی کے ہر شعبے میں پیمانہ، وزن اور پیمائش کا درست ہونا صرف ایک تجارتی ضابطہ نہیں، بلکہ انسانی اعتماد اور سماجی امن کی بنیادی شرط ہے۔ اگر ناپ تول میں کمی کی روایت عام ہو جائے تو اس کے ساتھ معاشرتی بد اعتمادی کی ایک زنجیر شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے، معاشی لین دین مشکوک ہو جاتا ہے اور بالآخر معاشرہ ایک دوسرے کے خلاف ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلام نے معاشی نظام کو محض منافع کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھا، بلکہ اسے ایک اخلاقی فریضہ اور عبادت کی حیثیت دی ہے بشرطے کہ وہ عدل، شفافیت اور امانت کے ساتھ ہو۔

کاروبار، تجارت اور روزگار میں اگر انسان حق کو پامال کرے، وزن کم کرے، یا کسی کو دھوکہ دے تو وہ صرف مالی نقصان نہیں کرتا، بلکہ معاشرتی توازن کو بھی خراب کرتا ہے۔ قرآن کا یہ حکم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معاشی زندگی میں سچائی اور انصاف کو بنیاد بنایا جائے، کیوں کہ معاشی نظام کی صحت ہی معاشرے کی مجموعی صحت کا پیمانہ ہوتی ہے۔

معاشی عدل کا اصل مطلب صرف قانون کے مطابق لین دین کرنا نہیں، بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ ہر فریق کے حق کو تسلیم کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ نفع کے لیے جھوٹ، فریب یا وزن میں کمی جائز ہے، تو وہ معاشرتی تعلقات کی بنیاد یعنی اعتماد کو ختم کر دیتا ہے۔ جب کہ اگر ہر کاروباری عمل میں عدل اور امانت کی رو سے کام لیا جائے تو کاروبار خود ایک عبادت بن جاتا ہے۔ انسان محنت کرتا ہے، روزی کماتا ہے، اور اپنے عمل میں اللہ کی حدود کا احترام کرتا ہے۔ یوں معاشی انصاف مثالی معاشرے کے لیے محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں، بلکہ سماجی استحکام کی شرط ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ہر ناپ تول، ہر لین دین اور ہر معاہدہ عدل کے ساتھ ہو، وہاں نہ صرف معاشی ترقی ممکن ہے، بلکہ انسانوں کے درمیان اعتماد، احترام اور بھائی چارے کا رشتہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔

(۸) عدلِ مطلق — معاشرتی بقا کی شرط

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا - جب تم بات کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

مثالی معاشرے کی بنیاد جس اصول پر مضبوطی سے کھڑی ہوتی ہے وہ عدلِ مطلق ہے۔ عدل صرف عدالت یا قانون کے اداروں تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک عمومی اخلاقی معیار ہے جو ہر انسان کے گفتار، کردار اور فیصلے میں موجود ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے اس اصول کو اتنی جامعیت سے بیان کیا کہ اس میں ہر طرح کے ذاتی، خاندانی یا سماجی مفادات کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔ رشتہ، قوم، مفاد کوئی بھی چیز انصاف سے اوپر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا اپنا بھائی، قریبی رشتہ دار، یا اپنے ہی قبیلے کا فرد ہو، پھر بھی انصاف سے منحرف ہونا جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عدلِ مطلق ایک ایسی اخلاقی حد ہے جو معاشرے کو جوڑے رکھتی ہے۔ جب انصاف کا معیار کمزور ہو جاتا ہے تو سماجی تعلقات میں عدم اعتماد، فساد اور انتشار بڑھتا ہے۔ لوگ طاقت، رشتہ داری یا مفاد کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں اور یہی وہ جگہ ہے جہاں قانون کے نام پر ظلم اور معاشرتی تقسیم جنم لیتی ہے۔ قرآن اس کے مقابلے میں واضح کرتا ہے کہ انصاف کو کسی بھی صورت میں قربان نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ عدل ہی معاشرے کو ایک منظم اور مستحکم شکل دیتا ہے۔

عدلِ مطلق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا کرے جس کے مطابق حق و باطل کا فیصلہ صرف اور صرف حقیقت کے مطابق ہو، نہ کہ کسی ذاتی پسند، بغض یا مفاد کے مطابق۔

یہ اصول نہ صرف عدالتوں کے لیے، بلکہ ہر فرد کے لیے ہے۔ کاروبار میں، خاندانی معاملات میں، تعلیمی نظام میں، اور معاشرتی روابط میں اگر ہر فرد اپنے عمل میں عدل کو اپنائے تو معاشرہ خود بخود انصاف کی بنیاد پر چلنے لگتا ہے، اور ظلم کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔ اس طرح عدلِ مطلق مثالی معاشرت کا وہ ستون ہے جو نہ صرف ظلم کو روکتا ہے، بلکہ انسانوں کے درمیان احترام، اعتماد

اور بھائی چارے کو برقرار رکھتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عدل ہر صورت میں مقدم ہو، وہاں ہر فرد اپنی عزت اور حقوق کے ساتھ محفوظ رہتا ہے اور اجتماعی زندگی میں توازن و استحکام ممکن ہوتا ہے۔

(۹) وفائے عہد — اخلاقی استحکام کی بنیاد

وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوفُوا۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ کسی بھی معاشرے کی اخلاقی صحت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں وعدے کس حد تک معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ عہد شکنی صرف ایک انفرادی کمزوری نہیں، بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو اجتماعی اعتماد کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جب قول و فعل میں تضاد پیدا ہو جائے تو نہ تعلقات محفوظ رہتے ہیں اور نہ ادارے مضبوط ہو پاتے ہیں۔ قرآن اس بنیادی اخلاقی مسئلے کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے وفائے عہد کو ایک لازمی دینی اور انسانی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ عہد الہی کا مفہوم صرف رسمی وعدوں تک محدود نہیں، بلکہ اس میں وہ تمام ذمہ داریاں شامل ہیں جو انسان نے شعوری یا عملی طور پر قبول کی ہوں۔ ایمان، معاملات، معاہدات، امانتیں اور سماجی وعدے سب اسی دائرے میں آتے ہیں۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ وعدہ چاہے اللہ سے ہو یا بندوں سے، اس کی پاسداری لازم ہے، کیوں کہ یہی وہ اصول ہے جو انسان کو اخلاقی طور پر معتبر بناتا ہے۔ جب معاشرے میں وفائے عہد کو اہمیت حاصل ہو تو باہمی اعتماد فروغ پاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے قول پر یقین کرتے ہیں، ادارے استحکام حاصل کرتے ہیں، اور اجتماعی نظم مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، جب وعدے وقتی مفاد کے تابع ہو جائیں تو بد اعتمادی، فریب اور انتشار جنم لیتا ہے، اور معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن اس زوال کو روکنے کے لیے وفائے عہد کو ایک مستقل اخلاقی معیار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وفائے عہد دراصل انسان کے باطن کی سچائی کا اظہار ہے۔ جو شخص اپنے وعدے پورے کرتا ہے وہ نہ صرف دوسروں کے حقوق کا احترام کرتا ہے، بلکہ اپنی ذات کو بھی اخلاقی بلندی عطا کرتا ہے۔ اسی اصول پر قائم معاشرہ اعتماد، استحکام اور وقار کی علامت بن جاتا ہے۔ یوں وفائے عہد مثالی معاشرت کا وہ بنیادی ستون ہے جو تعلقات کو مضبوط، نظام کو قابلِ اعتماد اور اجتماعی زندگی کو باوقار بناتا ہے۔

(۱۰) صراطِ مستقیم — فکری وحدت

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ۔ اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ انسانی معاشروں میں انتشار اور تصادم کی اصل جڑ فکری بکھراؤ ہے۔ جب سوچ کا مرکز ایک نہ رہے اور ہر فرد یا گروہ اپنی الگ سمت متعین کر لے تو نتیجہ اختلاف، افراط و تفریط اور باہمی ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قومیں اس وقت کمزور ہوئیں جب ان کے پاس عمل کا کوئی مشترک فکری محور باقی نہ رہا۔ قرآن اسی بنیادی مسئلے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے انسان کو ایک صراطِ مستقیم کی طرف بلاتا ہے یعنی ایسے راستے کی طرف جو فکری وحدت کا ضامن ہو۔

صراطِ مستقیم کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان کی عقل معطل ہو جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوچ، اقدار اور فیصلوں کی بنیاد ایک متعین اور حق پر مبنی اصول پر قائم ہو۔ قرآن اس صراط کو واضح، متوازن اور قابلِ فہم بناتا ہے، تاکہ انسان افراط و تفریط کے دو انتہاؤں میں نہ بھٹکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی فکر نہ تو بے لگام آزادی کی طرف لے جاتی ہے اور نہ جامد جمود کی طرف، بلکہ اعتدال اور توازن کو فکری اساس بناتی ہے۔ جب فکری وحدت قائم ہوتی ہے تو معاشرہ داخلی کشمکش سے محفوظ رہتا ہے۔ افراد کے اختلافات باقی رہتے ہیں، مگر وہ ایک مشترک اصول کے دائرے میں ہوتے ہیں، جس سے اختلاف فساد میں نہیں بدلتا۔ قرآن انسان کو یہی شعور دیتا ہے کہ اختلاف کے باوجود سمت ایک ہو، اور راستہ وہ ہو جو حق کے قریب تر ہو، کیوں کہ یہی اجتماعی زندگی کو سمت، ہم آہنگی اور استحکام فراہم کرتا ہے۔ اس طرح صراطِ مستقیم صرف ایک عقیدے کا عنوان نہیں، بلکہ ایک فکری نظام ہے جو ذہنوں کو منتشر ہونے سے بچاتا اور معاشرے کو وحدت، توازن اور اعتدال کی بنیاد پر قائم رکھتا ہے۔ جب سوچ کا رخ ایک ہو جائے تو عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، اور یہی فکری وحدت کسی بھی زندہ اور باوقار معاشرے کی اصل طاقت بن جاتی ہے۔

خلاصہ—قرآنی منشور اور اجتماعی نجات

سورہ انعام کی مذکورہ آیات کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ قرآن کی یہ ہدایات محض اخلاقی نصیحتیں یا روحانی وعظ نہیں، بلکہ ایک مکمل اور ہمہ گیر سماجی دستور ہیں۔ یہ آیات انسان کو صرف اچھا بننے کا مشورہ نہیں دیتیں، بلکہ ایک ایسا مثالی اور منظم معاشرہ تشکیل دینے کا طریقہ بتاتی ہیں جو احترام، انصاف، توازن اور اعتماد پر قائم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا خطاب محض انفرادی اصلاح تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ اجتماعی زندگی کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کسی مثالی معاشرے کا خواب دکھا کر بات ختم نہیں کرتا، بلکہ ہر انسان کو یہ ذمہ داری سونپتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی گفتار، کردار اور فیصلوں کو ان اصولوں کے تابع کرے۔ جب ایک فرد انسانی حقوق کی پاسداری کرتا ہے، اس کی جان کو تقدس فراہم کرتا ہے، عدل کو اختیار کرتا ہے، فکری وحدت کو اپناتا ہے اور اپنے عہد کا پابند بنتا ہے تو اس کے اثرات لازماً اس کے گھر، اس کے حلقہ احباب اور پھر پورے معاشرے تک منتقل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ تبدیلی کسی بیرونی جبر سے نہیں، بلکہ اندرونی شعور سے جنم لیتی ہے اور معاشرہ خود بخود ایک مثبت سمت میں بڑھنے لگتا ہے۔ لہذا، اگر ہم واقعی احترام، امن، عدل اور انسانی وقار پر مبنی زندگی کے خواہاں ہیں تو ہمیں محض ان اقدار کے نعرے لگانے پر اکتفا نہیں کرنا ہوگا۔ اس کے لیے قرآن کے اس عملی منشور کو بطور معیار اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

■ Mufti Aftab Rashk e Misbahi

- Research Scholar, Bihar University
- Phone: +91 90767 66235
- E-Mail: aftabrashk@gmail.com



نقشِ خیال

QUARTERLY
SUFITIMES

QUARTERLY SUFI TIMES

JAN FEB MAR 2026

سماع: دل کی تربیت اور روح

کی بیداری کا منظم سفر

رضا احمد رومی



سب سے پہلے ڈاکٹر مہدی کاظمی اور ان کے رفقا کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کی جانی چاہیے کہ طویل عرصے کی محنت، توجہ اور اخلاص کے بعد سماع اور صوفی روایت سے متعلق اس اہم کتاب کی تدوین مکمل ہوئی اور آج اس کی باقاعدہ رونمائی عمل میں آرہی ہے۔ یہ محض ایک کتاب کی تقریبِ اجرا نہیں، بلکہ ایک فکری، روحانی اور تہذیبی سفر کا سنگ میل ہے۔ اس موقع پر ذاتی سطح پر یہ مسرت بھی حاصل ہوئی کہ بچپن کے ایک عزیز دوست تیمور سے دوبارہ ملاقات ممکن ہو سکی۔ اور یہی صوفیہ کی روایت کا حسن ہے کہ وہ بچھڑے دلوں کو ملائی اور افراد کو کمیونٹی میں ڈھالتی ہے۔

صوفی روایت محض انفرادی روحانیت کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ معاشرتی تجربہ ہے، جہاں بیٹھک، صحبت اور اجتماع کے ذریعے دلوں کو جوڑا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں جب آج کے مقررین کی بصیرت افروز اور پُر مغز تقاریر سنی گئیں تو یہ احساس اور بھی گہرا ہو گیا کہ سماع پر گفتگو کرنا محض ایک فنی یا ثقافتی موضوع نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ روحانی ذمہ داری ہے۔

سماع: محض موسیقی نہیں، باطن کی صدا

جب ہم کسی دربار یا محفلِ سماع میں بیٹھتے ہیں اور لوگوں کے چہروں پر ٹھہراؤ، آنکھوں میں نمی اور خاموشی میں گہری روحانی حاضری دیکھتے ہیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں محض موسیقی نہیں ہو رہی۔ یہاں اجتماعی دلوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ سماع دراصل دل کی تربیت، نفس کی تہذیب اور قربِ الہی کی جستجو کا ایک منظم روحانی عمل ہے۔

لغوی اعتبار سے ”سماع“ کا مطلب سننا یا سماعت ہے، مگر صوفی روایت میں اس سے مراد وہ سماعت ہے جو دل میں اترے اور انسان کے باطن میں تبدیلی کا سبب بنے۔ ابتدائی صوفیہ کے نزدیک سماع قرآن کی تلاوت، نعت، صوفیانہ شاعری اور پھر دھن و لے کے ذریعے روحانی ذوق بیدار کرنے کا ذریعہ تھا۔ یہاں ایک بنیادی نکتہ ہمیشہ واضح رکھا گیا: مسئلہ آواز میں نہیں، سننے والے کی نیت اور کیفیت میں ہے۔

ہر کہ آوازِ حق شنید، آزاد شد
ہر کہ آوازِ نفس شنید، برباد شد

جو حق کی صدا سنتا ہے، وہ نفس کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے، اور جو صرف اپنی خواہشات کی آواز سنتا ہے، وہ ہر حسین شے کو بھی نفس کی غذا بنالیتا ہے۔

چشتیہ روایت اور سماع کا تمدنی کردار

برصغیر میں سماع کو روحانی وقار اور دوام بخشنے میں چشتی صوفیہ کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اجمیر شریف سے دہلی، اور حضرت خواجہ بختیار کاکی تک، چشتیہ سلسلے نے تبلیغ کو تصادم کے بجائے مکالمے میں بدلا۔ مقامی زبانیں، لوک روایتیں، راگ، اور شعری اظہار۔ سب کو اپنے اندر جذب کر کے تصوف کو ایک اخلاقی اور روحانی سانچے میں ڈھالا۔

یہی وہ فضا تھی جس سے بھکتی تحریک جیسی عظیم روحانی تحریک نے جنم لیا۔ گرو نانک، بھگت کبیر، بابا بلھے شاہ اور بنگال کے لالن فقیر۔ یہ سب اسی مشترکہ روحانی روایت کے امین تھے۔ انہوں نے سماع کے اصولوں کو عوامی، مقامی اور فکری زبان میں پیش کر کے دلوں میں جگہ بنائی۔

اسی روایت میں امیر خسرو جیسی نابغہ روزگار شخصیت پیدا ہوئی، جنہوں نے فارسی اور ہندوی، عشق اور موسیقی کو ایک مشترکہ روحانی زبان عطا کی۔ سات آٹھ صدیوں بعد بھی ان کا کلام زندہ ہے، اس بات کا ثبوت کہ سماع محض زبان نہیں بلکہ دل کی زبان بن جاتا ہے۔

سماع کے مراحل: نیت سے واپسی تک

سماع کوئی جامد رسم نہیں بلکہ ایک تدریجی روحانی سفر ہے، جس کے کئی مراحل ہیں:

نیت — سماع آواز سے پہلے نیت سے شروع ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کیوں سن رہے ہیں؟
نہ سن اس کو جو فقط کان کو بھائے

سن وہ جو دل کو بدل جائے

ادب — ادب کے بغیر سماع محض تماشا بن جاتا ہے۔

با ادب بانصیب، بے ادب محروم از لطفِ رب۔

محفل — محفل صرف جگہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی فضا ہے، جہاں کلام دل میں اترتا ہے۔

کلام — شاعری، عشق، ہجر، وصل، فنا و بقا کی زبان۔ یہی آنکھ دل کو کھولتی ہے۔

ذوق، وجد اور حال — کلام دل میں حرکت پیدا کرتا ہے، جو کبھی ذوق اور کبھی وجد میں ڈھل جاتا ہے۔

واپسی — اصل کمال کیفیت میں نہیں بلکہ باوقار واپسی میں ہے، جہاں دین اور دنیا کا توازن قائم رہتا ہے۔
فروغ — کتاب، محفل، اور پیشکش کے ذریعے یہ چراغ آگے بڑھتا ہے، اور دل سے دل تک روشنی منتقل ہوتی ہے۔

قوالی: سماع کی توانا عوامی صورت

قوالی سماع کی سب سے توانا اور عوامی شکل ہے۔ اس میں تکرار، لے اور اجتماعی آواز وہ کیفیت پیدا کرتی ہے جو تنہا ممکن نہیں۔
یہاں دلیل سے پہلے وابستگی کا اعلان ہوتا ہے۔ تصوف کی روح بھی یہی ہے۔

دل کا خالی ہونا کوئی کمی نہیں بلکہ گنجائش ہے۔ جب دل غرور اور خودی سے خالی ہوتا ہے تب ہی ذکر اترتا ہے:
خالی دل میں ہی اترتی ہے صدائے حق
بھرا ہوا خود سے، کہاں سنے گا؟

جدید عہد میں سماع کی خدمت

آخر میں Dr. Mehdi Kazmi کا خصوصی ذکر ضروری ہے، جن سے مصنف کا تعلق بھی اولیاء اور صوفی روایت کے حوالے سے قائم ہوا۔ شمالی امریکہ میں اولیاء کونسل آف نارٹھ امریکہ کے تحت ان کی خدمات محض اس کتاب کی تدوین تک محدود نہیں، بلکہ نیویارک میں ایک متروک چرچ کو خانقاہ، امام بارگاہ اور ملٹی فیتھ سینٹر میں تبدیل کرنا ایک غیر معمولی روحانی و سماجی کارنامہ ہے۔

یہ مرکز نہ صرف عبادت اور اجتماع کا مقام ہے بلکہ سماع کا ایک فعال اور مؤثر مرکز بھی بن چکا ہے، جہاں مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی اس روحانی تجربے سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں سماع دلوں کے درمیان پل بنتا جا رہا ہے۔

اختتامیہ

یہ کتاب اور یہ محفل اس بات کا اعلان ہے کہ سماع آج بھی زندہ روایت ہے — دل کی تربیت، روح کی بیداری اور انسانوں کے باہمی ربط کا مؤثر ذریعہ۔ ڈاکٹر مہدی کظمی اور ان کے رفقا واقعی نئی بستیاں آباد کر رہے ہیں — ایسی بستیاں جہاں عشق، ذکر اور سماع کے چراغ روشن ہیں۔

آخر میں تمام منتظمین، اہل علم اور حاضرین کا شکریہ کہ انہوں نے اس روحانی سفر میں شریک ہو کر اسے یادگار بنا دیا۔



■ Raza Ahmad Rumi

- Editor: Naya Daur Media
- Phone: +1 (202) 802-1201

غزل

فیصل صدیقی چشتی

کیا کوئی دوسرا نظر آے
ہے کوئی دوسرا نظر آے

وہ جو حق ہے نظر نہیں آتا
بس وہی، وہ ہمیں نظر آے

یہ جو ما بین آئینہ ہے نفس
یہ ہٹاؤ خدا نظر آے !!!

دہر میں اور کچھ بچا ہی نہیں
وہی وہ، جا بجا، نظر آے

جو حرم میں بھی نہی مل پاتے
دل کے بازار میں نظر آے !!!

یار میں عکس یار کا ہی تو تھا
وہ ہمیں یار میں نظر آے !!!

وہ جو واقف تھے سارے رازوں
اسکے دربار میں نظر آے !!!

جو کہیں بھی نظر نہیں آتا
وہ میرے یار میں نظر آے !!!

جن سے رازو نیاز ہوتے تھے
انکی سرکار میں نظر آے !!!

یہ نہاں سے عیاں کا قصہ ہے
خواب ہی خواب میں نظر آے

جن کو توفیق ہے محبت کی
انکے افکار میں نظر آے !!!

میں کہ فیصل ہوں یار کا بندہ
سب مجھے یار میں نظر آے



QUARTERLY
SUFITIMES

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
 جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
 دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
 الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
 ڈرتا ہوں دیکھ کر دل بے آرزو کو میں
 سسنان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا
 کیا آئے راحت آئی جو کنج مزار میں
 وہ ولولہ وہ شوق وہ ارمان تو گیا
 دیکھا ہے بت کدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
 ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
 افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
 لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا
 گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
 مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

بزمِ عدو میں صورت پروانہ دل مرا
گو رشک سے جلا ترے قربان تو گیا
ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا



اوپر نویس آن لاء ہم کیلئے ہیں
چوتھا ماہی
صوفی
QUARTERLY
SUFITIMES

گیلری

QUARTERLY
SUFITIMES





سرگرمیاں

QUARTERLY
SUFITIMES

QUARTERLY SUFI TIMES

JAN FEB MAR 2026

روحانی روایت، فکری تسلسل اور عالمی صوفیانہ پیغام

اولیاء کونسل آف نار تھ امریکا کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا جامع جائزہ

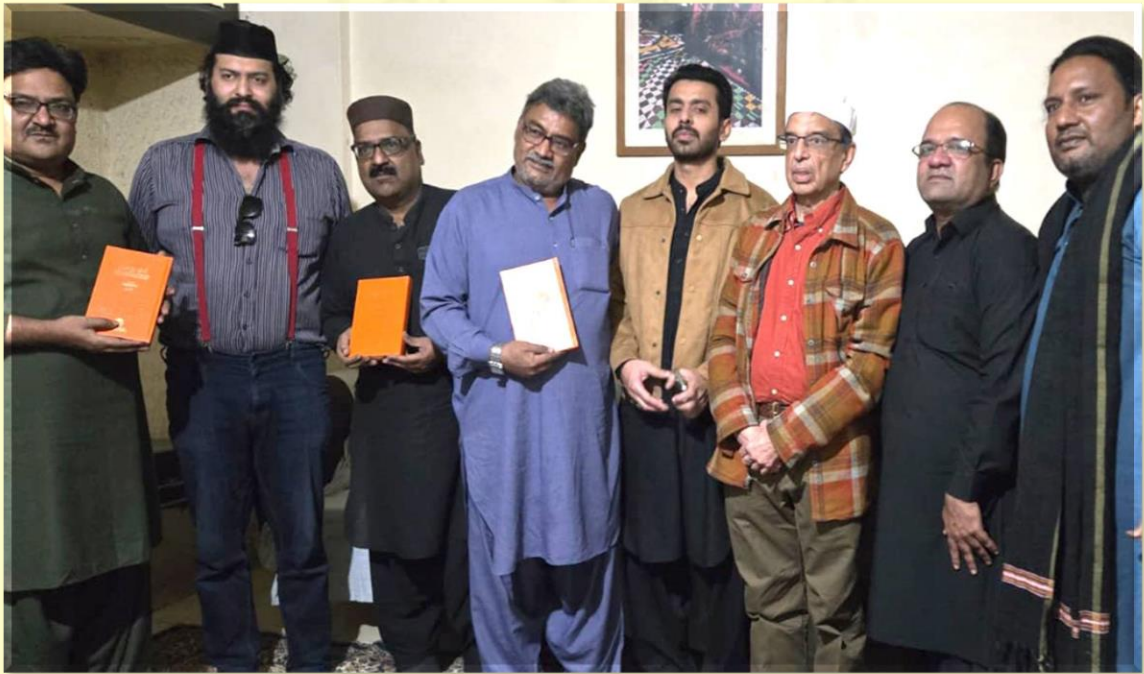


صوفیانہ روایات برصغیر کی تہذیبی اور روحانی شناخت کا وہ درخشاں باب ہیں جنہوں نے صدیوں سے محبت، رواداری، اخوت اور باہمی احترام کا آفاقی پیغام انسانیت تک پہنچایا۔ یہ روایات محض مذہبی اعمال تک محدود نہیں رہیں بلکہ ایک ہمہ گیر فکری اور اخلاقی نظام کی صورت میں پروان چڑھیں، جس کا مقصد انسان کو انسان کے قریب لانا اور دلوں کو جوڑنا ہے۔

اسی فکری و روحانی تسلسل کو عصر حاضر میں عالمی سطح پر آگے بڑھاتے ہوئے اولیاء کونسل آف نار تھ امریکا تصوف کے پیغام کو نئی جہتوں کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں منعقد ہونے والی محفلِ سماع، ختم خواجگان، علمی نشستیں اور تحقیقی سرگرمیاں اس امر کی غماز ہیں کہ تصوف کسی ایک خطے یا ثقافت تک محدود نہیں بلکہ ایک آفاقی پیغام ہے جو سرحدوں اور زبانوں سے ماورا ہو کر انسانیت کو وحدت میں پروتا ہے۔

اسی روحانی سلسلے کی ایک اہم کڑی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ۸۱۴ ویں عرس کی مناسبت سے منعقد ہونے والی باوقار تقریب ختم خواجگان تھی، جو خانقاہ چشتیہ فریدیہ، اولیاء کونسل سینٹر، مہوپیک (نیویارک) میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جمعہ کی نماز، فاتحہ خوانی، نعت خوانی، ذکر خواجہ، مناقب اور نیاز کا اہتمام نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا گیا۔ تقریب میں ممتاز علمی و دینی شخصیات مفتی امام الدین سعیدی، ڈاکٹر مہدی کاظمی اور راجہ اسد پرویز کی شرکت نے محفل کو فکری اور علمی وقار عطا کیا۔

ان روحانی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی میدان میں بھی ایک اہم پیش رفت سامنے آئی، جب اخبار تاثیر (پٹنہ) میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق کتاب نعمات سماع ہندوی کی تقریب رونمائی انجام پائی۔ یہ تصنیف اردو اور ہندی زبانوں میں سماع اور صوفی موسیقی کی روایت کا جامع مطالعہ پیش کرتی ہے اور اس کے فکری، تاریخی اور تہذیبی پہلوؤں کو نہایت سنجیدگی سے اجاگر کرتی ہے۔ اہل علم نے اسے صوفی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یہ کتاب نئی نسل کو تصوف کی اصل روح سے روشناس کرانے میں مؤثر کردار ادا کرے گی۔



اسی تسلسل میں ایک نہایت اہم پیش رفت مفتی امام الدین سعیدی صاحب کی امریکہ آمد کی صورت میں سامنے آئی۔ نیپال کے معروف مذہبی عالم اور فکری رہنما مفتی امام الدین سعیدی علمی وادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اولیاءِ کونسل آف نارٹھ امریکانے انہیں اپنی مسجد اور تعلیمی پروگرامز کے لیے بحیثیت امام وڈائریکٹر منتخب کیا اور اس مقصد کے لیے امریکہ مدعو کیا۔



۷/ نومبر کو رات گیارہ بجے نیویارک کے جے ایف کے ایئر پورٹ پر ان کی آمد ہوئی، جہاں صاحبزادہ مولانا علی سعید صفوی، ڈاکٹر محمود مہدی کٹلمی (سی ای او اولیاء کونسل)، راجہ اسد اقبال، ذوالفیضان اور دیگر ذمہ داران نے ان کا پر تپاک استقبال کیا۔ اگلے روز اولیاء کونسل میں باقاعدہ خیر مقدمی تقریب منعقد کی گئی، جہاں ڈاکٹر کٹلمی نے مفتی صاحب کو ادارے کے مختلف امور کی ذمہ داریاں سونپیں اور دعائیہ نشست بھی منعقد ہوئی۔

ایک ہفتے بعد محفلِ شکرانہ کے طور پر مجلسِ سماع کا انعقاد کیا گیا، جس میں خواجہ ابراہیم بن ادہم کے عرس کی مناسبت سے روحانی فضا قائم رہی۔ اس محفل میں علی زمان تاجی اور ان کے ہمنواؤں نے اپنے کلام سے سماں باندھ دیا۔ تقریب میں صاحبزادہ علی سعید، ڈاکٹر مہدی کاظمی، راجہ اسد، نور محمد تاجی، طاہرہ نقوی، ڈاکٹر اسامہ صادق، ڈاکٹر چنا و ما شنکر اور دیگر معزز شخصیات نے شرکت کی۔



ان تمام روحانی، علمی اور انتظامی سرگرمیوں کا مجموعی جائزہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اولیاءِ کونسل آف نار تھ امریکا محض روحانی اجتماعات تک محدود نہیں بلکہ صوفیانہ روایات کے تحفظ، فکری و ادبی کاوشوں کی سرپرستی اور نئی نسل کو تصوف کی اصل روح سے جوڑنے میں ایک فعال، منظم اور ذمہ دار ادارے کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ سرگرمیاں اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ تصوف آج بھی زندہ، متحرک اور انسانیت کو جوڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، اور یہ روحانی روایت پوری قوت کے ساتھ آنے والی نسلوں تک منتقل ہو رہی ہے۔



English Section

QUARTERLY
SUFITIMES



The Third of Sha‘bān: Imam Ḥusain and His Call for Justice and Action

Editorial - Dr. M. Mehdi Kazmi

Everyone recognizes the truth and understands what is just; the difference lies in this only a few choose to stand by it, while most do not.

In the Islamic understanding, God’s relationship with humanity is founded upon a primordial covenant known as **al-Mīthāq**—a covenant established with all the descendants of Adam. This covenant affirms that every human being is born with an innate recognition of God’s Lordship, an awareness embedded within human nature itself. The Qur’an gives this covenant explicit expression: “**And remember when your Lord took from the children of Adam, from their loins, their descendants, and made them testify concerning themselves, ‘Am I not your Lord?’ They said, ‘Yes, we testify’**” (Qur’an 7:172). This innate recognition is known as **fitrah**, the natural disposition through which no human being can claim complete ignorance of God. It is not acquired through culture, instruction, or history; rather, it precedes them all, forming the moral and spiritual foundation of human consciousness.

The nature of this covenant is neither political nor tribal. It is fundamentally spiritual and ethical, rooted in responsibility rather than privilege. God’s side of the covenant consists of guidance through prophets and revelation, mercy through repentance, and the promise of reward grounded in justice. Human beings, in turn, are entrusted with obligations: **tawḥīd**, the affirmation of divine unity; obedience to divine guidance; moral conduct anchored in justice, honesty, and compassion; and full accountability for one’s own actions. Justice, in this sense, is not merely a social arrangement or legal construct, but the lived expression of faith itself—the safeguarding of promises, equity, and moral balance in human affairs.

This covenant was reaffirmed repeatedly throughout history by successive

prophets, each renewing humanity's awareness through revelation, moral law, and social reform. With the advent of the Prophet Muhammad ﷺ, the covenant reached its final and universal articulation. The Qur'an stands as the last preserved guidance, and the moral framework of Islam defines how the covenant is to be lived both individually and collectively. Yet this was not meant to be a passive or purely intellectual faith. It demanded conviction—not the comfortable, insulated faith of quiet debates and inherited rituals, but a faith capable of drawing clear moral boundaries, confronting injustice, and reshaping societies. It required an idea sharp enough to divide truth from falsehood and powerful enough to compel action, even at the cost of life itself.

Central to this vision is the principle of **personal responsibility**. Each individual stands before God accountable for their deeds, without inherited guilt or delegated righteousness. No authority can absolve wrongdoing, and no lineage can substitute for moral action. The covenant is thus lived not only through belief, but through conscience and conduct.

It is within this ethical and theological framework that **Imam Ḥusain ibn 'Alī** emerges as a pivotal figure in moral history. His stand represents the embodiment of the individual covenant—the refusal to allow injustice to masquerade as religious legitimacy. Imam Ḥusain was not merely a historical actor responding to political circumstances; he was a revolutionary conscience, demonstrating that fidelity to the covenant may demand resistance when power abandons justice. Through his stand, the covenant was not Redefined but rescued from erasure.

The Qur'anic vision of covenantal life finds its social expression in Islam itself—not simply as a faith tradition, but as a civilizational principle. The Prophet Muhammad ﷺ emerged in a world profoundly fractured. Tribal Arabia was disintegrating into cycles of violence, while the great neighbouring empires—the Byzantine and the Sassanian—were exhausted, decaying, and morally hollow. The Near Eastern world had become, in many respects, a landscape of collapsed centers and torn civilizations. Peace, where it existed, was not a solution but a symptom of exhaustion.

The Prophet recognized this breakdown as a manifestation of humanity's failure to uphold its covenant with God. His response was neither withdrawal from the world nor conquest for its own sake, but the articulation of a moral system—rooted in the Qur'an and Sunnah—that translated the covenant into lived peace, justice, and social stability. Only within such a framework, he taught, could

moral, political, and economic progress genuinely occur. Human history, viewed through this lens, is the story of humanity's repeated struggle to honor or abandon this covenant. Progress is not merely technological or material; it is ethical and relational. As human beings develop ideas, institutions, and systems through their God-given will, true advancement occurs only when these creations align with justice, equity, and the well-being of all creation—human and non-human alike.

As the third of Sha'bān—the birth anniversary of Imam Ḥusain—approaches, it becomes incumbent upon us to reawaken this revolutionary covenantal consciousness. Imam Ḥusain's entire journey—from Medina to Mecca, from Mecca to Karbala, and into the moral afterlife of Karbala—must be understood not as a political rebellion nor as a tragic sacrifice in the conventional sense, but as a conscious and principled act to preserve the covenant between God and humanity. At its core, Karbala was not a battlefield; it was a theological and ethical reckoning. Any political authority that demanded obedience at the cost of this covenant was, by definition, illegitimate—regardless of its claims to power. It was precisely this line that Yazid ibn Mu'āwiya crossed. His demand that Imam Ḥusain offer **bay'ah**, an oath of allegiance, was not a mere request for political loyalty. It was an attempt to secure religious legitimacy for a system grounded in injustice, coercion, hereditary absolutism, and moral corruption. Had Imam Ḥusain acquiesced, tyranny would have been sanctified as an Islamic norm, and the covenant between God and the Muslim community would have been effectively annulled. Imam Ḥusain understood this with absolute clarity. His refusal was neither emotional nor impulsive; it was juridical, moral, and theological. He did not rise to seize power, nor did he view his stance as a heroic self-sacrifice.

Rather, he regarded it as an inescapable duty owed to God. In this sense, Karbala was not chosen—it was imposed by fidelity to the covenant. This understanding is reflected in the words attributed to him in his final moments: *"O God, I have fulfilled my obligation to You. Now fulfill Yours."* This was not despair, nor a plea for personal salvation. It was a declaration that the human side of the covenant had been upheld at the highest possible cost, and that the preservation of Islam itself was now entrusted to divine justice. To describe Karbala merely as a "battle" is therefore profoundly misleading. There was no contest of armies in any meaningful sense, nor a struggle for territorial gain. What occurred was the public exposure of injustice, the deliberate refusal to legitimize false authority, and the establishment of an eternal moral distinction. Imam Ḥusain did not fight to win; he stood so that truth would not die silently. Had this stand not occurred, the very idea of resistance within Islam would have been extinguished.

Injustice would have been absorbed into religious normativity, and submission to tyranny would have been mistaken for obedience to God. Humanity itself would have suffered a permanent moral deficit, as the right to say *no* to illegitimate power would have been erased from the moral imagination. In the post-Karbala world, human societies continue to oscillate between two paradigms. One is the **Hussaini paradigm**: a commitment to justice, dignity, equality, moral courage, freedom of conscience, and the sanctity of human will. It does not promise comfort or safety; it demands responsibility. Opposed to it is the **Yazidi paradigm**, in which tyranny is disguised as order, domination is rationalized as stability, and religion is weaponized to silence conscience. The contemporary Muslim world, fragmented and unstable, bears painful witness to the consequences of abandoning the Hussaini ethic. In this sense, the Hussaini idea is not merely a historical memory or sectarian symbol. It is the last remaining moral instrument for genuine human progress. It affirms that faith without justice is hollow, that power without ethics is illegitimate, and that silence in the face of oppression is itself a breach of the covenant. Karbala is not a memory to be mourned; it is a principle to be lived. Karbala affirms the uncompromising truth that sovereignty belongs to God alone, and that all human power is legitimate only insofar as it serves justice, dignity, and moral accountability. Imam Ḥusain's stand was not a quest for rule, but a conscious refusal to sanctify tyranny, completing the prophetic ethic that denies absolute authority to kings, dynasties, and coercive systems. Wherever this principle is abandoned, societies decay; wherever it is embraced, resistance becomes fidelity rather than rebellion. In this light, Karbala transcends geography, religion, and time. It speaks to every context in which human will is suppressed and moral truth is silenced. Resistance to injustice is not rebellion against order, but fidelity to divine sovereignty. Let us therefore renew our commitment to the governance of God—not as a slogan, but as an ethical obligation. Let us recognize that the human will, gifted by the Divine, carries responsibility as well as freedom. And let us pray that this will is not merely acknowledged, but **activated**—in thought, in conscience, and in action. The call to action, therefore, is neither abstract nor symbolic; it is a concrete moral obligation to stand unwaveringly for equality, justice, and peace, and to resist every manifestation of tyranny—whether the tyranny of distorted ideas that silence conscience, the tyranny of unchecked authority that erodes accountability, or the political, cultural, and economic systems that normalize inequality and perpetuate injustice. This resistance is not merely oppositional, nor is it confined to public protest or historical remembrance; it begins within the individual conscience and extends outward into collective

responsibility. To oppose injustice in all its forms is to affirm the dignity of the human will as entrusted by God, and to refuse complicity in structures that degrade truth and humanity. Only through such principled commitment—sustained in thought, action, and moral courage—do individuals and societies fulfill their side of the covenant with God, preserving the sacred balance between faith and justice upon which both spiritual integrity and human progress depend.

▪ **Dr. M. Mehdi Kazmi**

- Auliya Council of North America
- Phone: +1 (914) 525-1945
- E-Mail: montesynapse@gmail.com



Commentary and Remarks on Dr. Mehdi Kazmi's Editorial by **Dr. Hasnain Valji**, Board Member
Imam Ali Research Center, Mahopac, New York

January 30th, 2026

From the opening lines, it is clear that this is not an academic exercise or a commemorative piece. It is a moral intervention. You are not describing Imam Ḥusain. You seem to be standing beside him, asking the reader to stand there too, without the comfort of distance. Your use of al-Mīthāq as the entry point is deliberate and intelligent. It shifts the conversation away from sectarian memory and toward universal responsibility. The covenant is not presented as theology to be admired, but as a burden to be carried. This immediately raises the stakes. Faith is no longer private. It is no longer safe. The paper's greatest achievement is that it restores weight to justice. Justice here is not a slogan. It is not a policy. It is not an emotion. It is the lived proof of belief. By rooting justice in fitrah, you have truly dismantled the excuse of ignorance. No one escapes. No one is exempt. The reader is drawn into the argument before they realize they are being judged by it. That is creative writing. And it is honest writing. The portrayal of Imam Ḥusain is restrained, which makes it powerful. There is no theatrical martyrdom. No ornamental sorrow. Instead, we see obligation. Clarity. Refusal. His stand is not emotional. It is juridical. Moral. Inevitable. Karbala becomes not an accident of history but the moment when silence became impossible. What is most impressive is the restraint. The paper does not shout. It does not beg. It does not decorate itself with outrage. It simply keeps tightening the moral circle until the reader stands inside it, alone with their conscience. The ending does not comfort. It activates. Justice is no longer optional. Resistance is no longer political. Silence is no longer neutral. The paper leaves the reader with no place to hide, which is exactly what writing about Imam Ḥusain should do. This is not a paper to be admired. It is a paper to be answered. It is indeed a call for justice and action. Jazakallah. To put it in Imam Hussains AS words: "THE LIKES OF ME CANNOT DO BAYAT TO THE LIKES OF HIM"



Ecology in Islamic Thought

Ali Saeed Safwi

The contemporary ecological crisis has forced religious traditions to revisit their foundational sources and ask what resources they offer for imagining a just and sustainable relationship between humans and the natural world. Islam, as a scriptural and legal tradition with a long intellectual history, contains a rich vocabulary for thinking about nature, responsibility, and moral limits. Far from being indifferent to environmental concerns, Islam's central concepts such as divine unity, human stewardship, balance, and justice can be reread today as an ethical framework that speaks directly to questions of ecology and environmental responsibility.

This article offers a synthetic overview of how key Islamic ideas might inform an ecological ethic today. It does not claim to reproduce any one scholar's argument, but instead sketches a broad, constructive picture of how Qur'anic theology, prophetic practice, and legal reasoning together generate a distinctive way of imagining nature and human action within it.

Normative sources and their character

Islamic reflection on nature and ecology begins with the normative sources of the religion: the Qur'an, the sayings and practices of the Prophet Muhammad, and the legal-ethical tradition known as *fiqh*. The Qur'an is not a systematic treatise on law or environmental policy; it is a revelatory discourse whose meaning emerges through careful interpretation, imaginative engagement, and communal reflection. Its verses move across multiple registers metaphysical, natural, and moral so that discussions of the cosmos, divine attributes, and human conduct are constantly intertwined rather than separated into different disciplines. The prophetic reports, while compiled later and often framed around practical

questions of ritual, social order, and governance, preserve concrete examples of how the earliest Muslim community understood land use, water rights, animal welfare, and protection of certain spaces. Over time, jurists working with these materials developed more systematic legal categories such as land classifications, rules concerning water and pasture, or the designation of protected zones that embed environmental concerns within a broader framework of social justice and public welfare.

Qur'anic vision of nature

In the Qur'an, nature is neither a random collection of objects nor a mere backdrop to human drama; it is a coherent, ordered system governed by stable patterns that are repeatedly associated with divine command. Mountains, rivers, winds, plants, animals, and sky are described as functioning according to regular laws, which makes the world intelligible and invites humans to observe, reflect, and learn. Natural phenomena thus become signs that point beyond themselves, indicating both the wisdom of the creator and the moral order embedded in the fabric of existence.

At the same time, the Qur'an insists that nature does not contain within itself the ultimate ground of its own being; it exists because it has been brought into existence and sustained by a reality beyond it. This double emphasis on the regularity of natural processes and on their dependence upon a higher source produces a kind of theistic naturalism: the world is lawful and coherent on its own level, yet always transparent to a transcendent meaning that it cannot fully contain. The result is that studying nature, benefiting from it, and working within it are not acts opposed to religion but can themselves be modes of responding to divine signs.

Human beings as trustees

Human beings occupy a distinctive position in this Qur'anic picture. Humanity is described as honored among creatures and endowed with special capacities of intelligence, language, and moral responsibility, yet this exalted status is framed in terms of burden rather than privilege. The scriptural language of "trust" and "vicegerency" (khilāfah) portrays humans as bearers of a responsibility that other elements of creation declined to carry, precisely because of its weight. To say that the human being is a trustee is to say that the natural world does not belong to humanity in an absolute sense; dominion lies with the

creator, while humans act as stewards who must answer for how they use what has been entrusted to them. This trusteeship is tied to a primordial covenant, in which the human creature acknowledges its dependence upon and accountability to the divine, and thereby accepts limits to its own claims over the earth and its resources. The Qur'an connects the violation of these limits to the broader theme of corruption on earth, warning that human actions can disturb a cosmic balance that is otherwise characterized by proportion and order.

Balance, measure, and justice

A recurring Qur'anic motif is that everything in the universe has been created "in due measure" and according to a "balance." This language of measure and balance operates on more than one level: it captures the idea of physical regularities in nature, but it also expresses a moral structure woven into the cosmos. Natural law and moral law are not unrelated; injustice, greed, and uncontrolled desire ultimately manifest as disruptions of the wider order within which humans find themselves. From this perspective, environmental degradation is not only a technical or economic problem but a symptom of a deeper ethical failure. When humans act without regard for limits over-exploiting land, polluting air and water, or destroying habitats they are not only harming other creatures but doing violence to themselves, because they are participants in the very system they damage. Classical Islamic discourse sometimes expresses this idea through the notion of "wronging oneself," suggesting that wrongdoing inevitably comes back to hurt you by destroying the conditions you need to flourish.

Prophetic practice and early norms

Although the Prophet of Islam did not face climate change or industrial pollution in the modern sense, reports about his practice suggest an attitude toward the environment shaped by restraint, mercy, and concern for public welfare. Traditions dealing with water use, for example, emphasize avoiding waste even when resources appear abundant and stress equitable access to shared sources such as wells and streams. Reports about animals highlight prohibitions against cruelty, needless killing, or using living creatures merely as targets for entertainment. Early Muslim authorities created special protected areas where people were not allowed to overuse land, water, or wildlife. They did this to make sure natural resources would last. These protected zones, explained through Islamic legal rules, show that the community was willing to give up some private

or short-term benefits in order to protect long-term environmental and social well-being. Even though these ideas were formed long ago, they still give us useful language for talking about environmental protection, shared resources, and responsible management today.

Modern context and challenges

Today's environmental crisis has developed within a global system shaped by modern science, industry, and colonialism. Many Muslim-majority countries now use economic and social systems that came from outside and were often forced onto them. These new systems changed local traditions and weakened older, more balanced ways of living with the land and natural resources. Because of this modern situation, Islamic teachings about the environment cannot simply repeat ideas from the past. They must now deal with new realities like advanced technology, greater inequality, and new types of environmental danger that did not exist before. At the same time, there is a lively discourse within contemporary Muslim thought about how to respond. Some voices emphasize recovering neglected aspects of the tradition, such as humility before nature, restraint in consumption, and the spiritual significance of the created world. Others explore how concepts like stewardship, trust, and justice might inform policy debates on issues such as climate change, deforestation, and urbanization. Across these approaches, the underlying conviction is that Islamic sources offer more than general spiritual comfort; they can ground concrete ethical and legal responses to environmental degradation.

Toward an Islamic ecological ethic

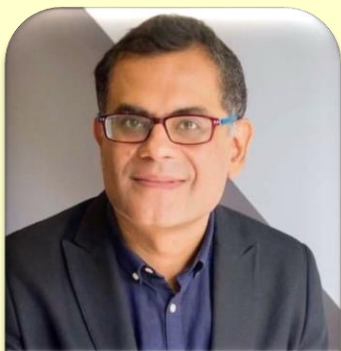
Drawing these strands together, an Islamic ecological ethic would likely rest on several interrelated convictions. First, nature is meaningful: it is not merely raw material for human projects but a realm of signs that discloses wisdom, order, and mercy. Second, humans are both privileged and bound: endowed with special capacities, but obligated to exercise them within the limits set by trust, answerability, and respect for the larger balance of creation. Third, justice is inseparable from ecology: the way resources are distributed, the communities that bear environmental burdens, and the species pushed toward extinction are all ethical questions, not merely technical ones. Fourth, knowledge of natural processes is encouraged, not discouraged, because understanding the lawful patterns of the world is part of reading the signs embedded in creation and

thus, a dimension of religious responsibility. From these starting points, concrete principles such as avoiding waste, protecting the vulnerable, preserving biodiversity, and prioritizing long-term communal welfare over short-term gain can be articulated in explicitly Islamic terms. Allah says: *“And the heaven He raised and established the balance, so that you may not transgress the balance.”* (Qur’an 55:7–8)

Conclusion

Islam’s foundational sources do not present a ready-made environmental policy, but they do offer a coherent set of images, concepts, and values that can inform a contemporary ecological ethic. By emphasizing divine ownership, human trusteeship, cosmic balance, and the inseparability of justice from the natural order, the tradition invites Muslims to see environmental responsibility as an integral part of living faithfully rather than an optional, external concern. For scholars, activists, and communities seeking to respond to ecological crisis from within an Islamic framework, the task is both interpretive and practical: to reread the tradition in light of present realities, and to translate its insights into institutions, habits, and policies that honor the trust of stewardship over the earth.

- **Ali Saeed Safawi**
- Research Scholar, Hartford International University
- Phone: +91 90051 33338
- E-Mail: alisaeed787@gmail.com



Sama: A Disciplined Journey of the Heart and the Awakening of the Soul

Raza Ahmad Rumi

*This essay is based on remarks delivered by the renowned intellectual and researcher [Raza Rumi](#) on the occasion of the book launch of *Naghmāt-e-Samā‘-e-Hindvī*. In his address, he thoughtfully examined samā‘, the Sufi tradition, and particularly the spiritual and civilizational role of the Chishfī order, situating them within a broader intellectual, cultural, and humanistic framework. What follows is a written rendering of that discourse.*

First and foremost, heartfelt congratulations are due to [Dr. Mehdi Kazmi](#) and his colleagues, whose long-standing dedication, care, and sincerity have culminated in the completion and formal unveiling of this important work on samā‘ and the Sufi tradition. This occasion is not merely the launch of a book; it marks a milestone in an intellectual, spiritual, and cultural journey. On a personal note, it was also a moment of joy to reconnect with a dear childhood friend, Taimur—an experience that beautifully reflects the essence of the Sufi tradition: bringing separated hearts together and transforming individuals into a living, breathing community. The Sufi tradition is not confined to individual spirituality alone; it represents a living social experience in which hearts are connected through companionship, shared spaces, and collective gatherings. In this context, listening to the insightful and thought-provoking speeches of today’s speakers deepened the realization that speaking about samā‘ is not merely an artistic or cultural exercise, but a serious spiritual responsibility.

Samāʿ : Not Mere Music, but the Voice of the Inner Self

When one sits in a shrine or a gathering of samāʿ and observes the stillness on faces, the moisture in eyes, and the profound spiritual presence within silence, it becomes evident that this is not simply a musical performance. Rather, it is a direct address to the collective heart. Samāʿ is a structured spiritual practice aimed at disciplining the heart, refining the ego, and seeking closeness to the Divine. Linguistically, the word *samāʿ* means listening or hearing. In Sufi practice, however, it signifies a form of listening that penetrates the heart and brings about inner transformation. Early Sufis regarded samāʿ—through Qurʾanic recitation, devotional praise, mystical poetry, and melody—as a means to awaken spiritual sensitivity. One foundational principle was always emphasized: the issue lies not in the sound itself, but in the listener's intention and inner state. Those who hear the voice of Truth are set free, while those who hear only the voice of the ego are undone. One who listens to the call of Truth is liberated from the captivity of the self, while one who listens only to personal desire turns even beauty into nourishment for the ego.

The Chishtī Tradition and the Civilizational Role of Samāʿ

In the Indian subcontinent, it was the Chishtī Sufis who gave samāʿ enduring spiritual dignity and continuity. From Ajmer Sharif to Delhi, and through figures such as Khwāja Bakhtiyār Kāḳī, the Chishtī order transformed religious outreach from confrontation into dialogue. By embracing local languages, folk traditions, musical modes, and poetic expression, they shaped Sufism into a moral and spiritual framework deeply rooted in society. It was within this environment that major spiritual movements such as the Bhakti tradition emerged. Figures like Guru Nanak, Bhagat Kabir, Bulleh Shah, and Bengal's Lalun Fakir were all inheritors of this shared spiritual heritage. By presenting the principles of samāʿ in accessible, local, and reflective languages, they found a place in the hearts of the people. From this same tradition arose the extraordinary figure of **Amir Khusrau**, who fused Persian and Hindavi, love and music, into a unified spiritual language. Centuries later, his verses remain alive, testifying to the fact that samāʿ transcends language and becomes the language of the heart.

The Stages of Samāʿ : From Intention to Return

Samāʿ is not a static ritual but a gradual spiritual journey with several stages. It begins with intention, even before sound, asking why one listens in the

first place. Without reverence, samā' is reduced to spectacle, for spiritual listening requires humility and adab. The gathering itself is not merely a physical space but an ethical and spiritual environment in which words can settle into the heart.

Poetry then becomes the language of love, separation, union, annihilation, and permanence, awakening the inner vision. As the heart responds, the experience may unfold as spiritual taste, ecstasy, or inner absorption. Yet true excellence lies not in the intensity of experience, but in a dignified return, where balance between faith and worldly life is restored. Through books, gatherings, and living traditions, this light continues onward, passing from heart to heart.

Qawwālī: The Most Vibrant Public Expression of Samā'

Qawwālī represents the most powerful and communal form of samā'. Through repetition, rhythm, and collective voice, it generates a state that cannot be achieved in isolation. Here, commitment precedes argument, an idea that lies at the very heart of Sufism. An empty heart is not a deficiency, but a space of possibility. Only when the heart is emptied of arrogance and ego does remembrance truly descend. The voice of Truth enters only an empty heart.

- **Raza Ahmad Rumi**

- Editor: Naya Daur Media
- Phone: +1 (202) 802-1201

